

اکثر یاد آتے ہیں؟؟

اکثر یاد آتے ہیں

مولانا عبدالحق علی فاروقی

از: مولانا عبدالحق علی فاروقی

جون ۲۰۱۹ء سے پابندی کے ساتھ شائع ہونے والا رسالہ

ماہنامہ البدر کاکوری

مولانا عبدالحق علی فاروقی

اسلامی تعلیمات کا سنجیدہ ترجمان

اسلام کے دفاعی امور پر کانڈر سپاہی

اصلاحی جہم کا قابل اعتماد و باوقار وکیل

ملکی و بین الاقوامی عصری مسائل پر بے لاگ و بے باک ادارے

علماء، صلحاء اور صاحب نظر مفکرین کے تازہ و بیش قیمت مضامین سے آراستہ اور
آہنزیں امتیازی عنوان "آئینہ" جس میں طنز و مزاح کے پیرایہ میں مذہب اور
سماج کے رستے ہوئے ناسوروں کی کامیاب جراحی کی جاتی ہے۔

میریاری کتابت و طباعت، خوبصورت ناسل اور پکڑش زبان و بیان

سالانہ قیمت مبلغ دو سو روپے بھیج کر آج ہی ممبر بننے اور ڈاک سے ہر ماہ یہ تحفہ حاصل کیجئے۔

نمونہ کا پرچہ مفت طلب کر کے حاصل کیجئے

رابطہ کا پتہ

MONTHLY
البدر
KAKORI, LUCKNOW-226101

ماہنامہ

کاکوری، لکھنؤ-۲۲۶۱۰۱

Luna Printing Press, Lko. # 9450307127

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

اشاعت اول ۲۰۲۳ء
نام کتاب اکثر یاد آتے ہیں
نام مصنف مولانا عبدالعلی فاروقی

(فاضل دیوبند، ایم۔ اے اردو، ایم۔ اے عربی)

E-mail: aafarooqi4@yahoo.com

Mobile No. 9415775044

کمپوزنگ عبدالقدوس ندوی
صفحات ۲۰۰
تعداد چار سو (۴۰۰)
طباعت لونا پرنٹنگ پریس، لکھنؤ
قیمت ₹300/-



ملنے کا پتہ

مکتبہ البدر کاکوری، لکھنؤ—۲۲۶۱۰۱ (انڈیا)

MAKTABA AL-BADR

KAKORI, LUKC NOW-226101 (INDIA)

Mob. No. 9450110463, 9839181475

أحسن كما أحسن الله إليك

..... اکثر یاد آتے ہیں —؟؟

وہ اکابر و اعظم، اعز و اقربا، اور وہ ہمسرو، ہم نوا، جنہوں نے جیتے
جی اپنی الفت و محبت کے ذریعہ دل پر حکمرانی کی، اور دنیا سے
کوچ کرتے ہوئے اپنی یادوں کے چراغ روشن کرتے گئے۔

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں
(حسرت موہانی)

(از فلم

مولانا عبدالعلی فاروقی

(فاضل دیوبند، ایم۔ اے اردو، ایم۔ اے عربی)

ناشر

مکتبہ البدر، کاکوری، لکھنؤ—۲۲۶۱۰۱

MAKTABA AL-BADR

KAKORI, LUKC NOW-226101 (INDIA)

Mob. No. 9450110463, 9839181475

فہرست

کیا — کہاں

۶	انتساب	۱
۷	حرفے چند	۲
۱۱	مقدمہ	۳
۱۳	میری اماں — یعنی میری نانی	۴
۲۷	ایک بھولے بسرے محسن کی یاد	۵
۳۵	میرے حافظ جی	۶
۴۳	حکیم الاسلام کے خانوادہ فاروقی سے روابط	۷
۵۱	خدا حافظ — امی	۸
۵۵	میرے آخری استاذ — مولانا محمد سالم قاسمیؒ	۹
۶۹	مولانا محمد واضح حسنی — ایک مرد خدا مست تھا نہ رہا	۱۰
۷۷	شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند — مفتی سعید احمد صاحبؒ	۱۱
۸۵	ایک باختیار مہتمم ایسے بھی	۱۲

☆☆☆

یہ کتاب

فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ
حکومت اترپردیش

کے

مالی تعاون سے شائع ہوئی

☆☆☆

انتساب

امی — آپ کے نام

اور یہ تو آپ کا حق تھا — کیوں کہ
چند برس قبل شائع ہونے والی میری کتاب ”میں نے بھی جنہیں دیکھا
ہے“ کا انتساب

میری اور آپ کی مشترکہ **امان** (نانی صاحبہ مرحومہ) کے نام تھا۔
امی! آپ کا وجود تو ایک ایسی ڈور کا تھا، جس کے ٹوٹنے ہی ایک ایک
کر کے بڑی تیزی کے ساتھ آپ کے چہیتے آپ کے پاس پہنچنے کے لئے بے قرار سے
نظر آرہے ہیں:-

پہلے آپ کے بڑے داماد محمد عرفان عالم۔ پھر آپ کے سب سے بڑے
نواسے عبدالمنان۔ پھر ابھی چار ماہ قبل ہی آپ کے چہیتے داماد حفیظ اللہ اور اب آپ
کو ماں بنانے والی آپ کی بڑی بیٹی سمیہ آپ کی آغوشِ محبت و شفقت میں پہنچ چکے
ہیں — اور میں بھی اپنے رب کے فیصلہ کا منتظر ہوں۔

ابھی آپ کو ہم سے جدا ہوئے چھ برس کا عرصہ ہی تو ہوا ہے — مگر
کتنے ہونٹوں کی ہنسی ساتھ گئی ہے تیرے
موت بھی سوچ رہی ہے کہ یہ کون آیا ہے

آپ کا ناقدِ رالین دلارا بیٹا
عبدالعلی فاروقی

۹ دسمبر ۲۰۲۰ء

۱۳	بھائی صاحب (پروفیسر عبدالحی فاروقی)	۹۱
۱۴	ملک زادہ صاحب کی انکساری وسادگی	۹۷
۱۵	انور جلالپوری — ایک طرح دار شخصیت	۱۰۳
۱۶	ڈھونڈھان کو چراغِ رخ زیبائے کر	۱۰۹
۱۷	حفیظ نعمانی — ایک صحافی، ایک انسان	۱۱۳
۱۸	خواجہ یونس — مٹے بھی تو اک داستاں ہو گئے ہم	۱۱۹
۱۹	عبدالمنان قاسمی — وہ ڈوب بھی گیا تو شفق چھوڑ جائے گا	۱۲۵
۲۰	حسین امین — سنجیدہ صحافی، عظیم انسان	۱۳۱
۲۱	حافظ محمد ہاشم مرحوم	۱۳۹
۲۲	بھائی سید ضیاء الحسن صاحب	۱۴۵
۲۳	ایک دیا اور بجھا اور بڑھی تاریکی	۱۶۱
۲۴	میرے حفیظ بھائی جان	۱۷۱
۲۵	مولانا محمد عرفان قاسمی	۱۷۹
۲۶	میری باجی جان	۱۸۷
۲۷	”گل بانگ ازل“ پر ایک نظر	۱۹۵

☆☆☆

***** ❁ *****

حرفے چند

لکھنؤ شہر کے جس علاقہ میں میرا رہنا سہنا ہے وہاں کرفیو کا تو اتنی مرتبہ سامنا کرنا پڑا کہ اس کی ”عادت“ سی ہو گئی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس لعنت اور اس کے اسباب سے نجات پانے کی دعائیں اپنے رب سے کیا کرتا تھا۔ اور اپنے رحمان و رحیم رب کا کیوں کر شکر گزار ہوں کہ اس نے میری اور مجھ جیسے اپنے بہت سے دیگر بندوں کی دعاؤں کو شرف قبول سے نوازا، اور ایک طویل عرصہ سے ”باضابطہ و اعلانیہ کرفیو“ کا سامنا نہیں کرنا پڑا ہے۔

لیکن بڑھاپے کی اس منزل میں کہ ”سٹھیانے“ کی حدوں سے بھی آگے بڑھ چکا ہوں ”لاک ڈاؤن“ جیسی بلا سے گزرنا پڑا، جس کا تجربہ تو کیا ہوتا، نام تک پہلی مرتبہ سنا تھا اور اول وہلہ میں سمجھ ہی میں نہیں آسکا تھا کہ اس میں کیا ہوگا اور کن حالات سے دوچار ہونا پڑے گا؟۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح اس کے سبب ”کرونا“ کا نام پہلی مرتبہ سنا اور پڑھا تھا۔ میں اب تک یہ فیصلہ نہیں کر پایا ہوں کہ ”کرونا“ اور اس سے بچاؤ کے لئے لگنے والے ”لاک ڈاؤن“ میں سے کون سا عذاب بڑا ثابت ہوا؟۔

”کرونا“ تو ایک وبا کی صورت میں ساری دنیا میں آیا، جس میں بتلا ہو کر لاکھوں انسانوں کی ہلاکت ہو چکی، اور ابھی اس کا قہر جاری ہے۔ تاہم طاعون، ملیریا، ڈینگو اور چکن گنیا جیسی متعدد وباؤں اور ان سے ہونے والی انسانی ہلاکتوں کی وجہ سے انسانی بستیوں میں وباؤں کے آتے رہنے کا ایک تجربہ تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی ایک وبا کے ایک ساتھ پوری دنیا میں اس

طرح پھیلنے اور اتنی بڑی تعداد میں انسانی جانوں کی ہلاکتوں کا نہ صرف پہلا تجربہ ہوا بلکہ قادر و مقتدر اللہ کی قدرت کاملہ کا یہ نمونہ بھی سامنے آ گیا کہ اس کی بھیجی ہوئی ایک نامعلوم اور ان دیکھی وبا کا مقابلہ کرنے سے ساری دنیا کے ڈاکٹر، سائنس دان، اپنے کو نفع و نقصان کا مالک سمجھنے والے ملحدین، اور ارض و سماء پر اقتدار و حاکمیت کے دعویدار تمام حکمران و ارباب اقتدار اس طرح بے بس و لاچار نظر آئے کہ کم و بیش ایک برس کا عرصہ گزر جانے کے باوجود اب تک نہ اس کے دفاع کے لئے کوئی دوا یا ویکسین بن سکی ہے، نہ ہی اس وبا سے نجات کے لئے مستقبل کے کسی وقت کی تعیین کرنے کی کسی کے اندر ہمت ہے؟۔

کیا اب بھی اس کائنات کے ایک اکیلے خالق و مالک اور اس کی ناقابل شکست قدرت و گرفت سے انکار کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟۔

ان تمام تفصیلات کے ساتھ ”کرونا“ اور اس کا قہر اپنی جگہ، لیکن اس کی ”رعایت“ میں لگنے والا ”لاک ڈاؤن“؟؟۔ الحفیظ الامان الحذر۔ جہاز اور ریل سے لے کر سائیکل اور سائیکل رکشہ تک تمام سواریاں بند، عبادت گاہوں و تفریح گاہوں سے لے کر بازار ہاٹ سب بند۔ اسکول کالج مدر سے اور پانچھ شالے سب بند۔ منڈیاں شاپنگ مالس سے لے کر میٹنگ ہال اور میرج لان تک سب بند، گھروں سے باہر نکلنے ہی نہیں، مریضوں کو ہسپتال اور مردوں کو شمشان یا قبرستان پہنچانے پر بھی طرح طرح کی پابندیاں؟۔ غرضیکہ صورت حال کچھ یوں کہ ۔

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

ہمارے ملک میں ۲۴ مارچ ۲۰۲۰ء سے لگنے والے ”لاک ڈاؤن“ کے دوران چوں کہ زندگی کی رفتار بالکل تھم گئی تھی۔ اس لئے کتابوں اور اخبار کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ فون کے ذریعہ اپنوں بلکہ ”بھولے بسروں“ سے بھی فون کے ذریعہ رابطہ کے خوب خوب مواقع ملتے رہے۔ انٹرنیٹ کے اس دور میں

دور دراز کے احوال سے باخبر رہنا بھی آسان تھا۔ اچھی بری ہر قسم کی خبریں ملتی رہیں، البتہ خوش کن اور مسرت بخش خبروں کے مقابلہ تکلیف دہ اور رنج رساں خبریں کچھ زیادہ ہی ملیں۔ بڑی تعداد میں علماء و اکابر، دوست احباب، اور اعزہ واقارب کی اس دنیائے فانی سے رخصت ہونے کی اطلاعات نے کچھ زیادہ ہی رنجور و مغموم کیا، خصوصاً وہ لوگ جن کی نماز جنازہ، اور آخری منزل تک پہنچا کر عام حالات میں تسکین قلب کا کچھ سامان بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن ”خانہ قید“ ہونے کی وجہ سے اس سعادت سے بھی محرومی رہی۔ ان میں سے کچھ وہ بھی تھے جن سے جدائی کے کرب کو کبھی کسی کی فرمائش پر اور کبھی صرف اپنی اور دنیا سے کوچ کرنے والے اعزہ کے پسماندگان کی دل جوئی کے لئے صفحات قرطاس پر بکھیرا رہا۔ دھیرے دھیرے کر کے ایسے کئی مضامین ہو گئے۔ میرا ماہنامہ رسالہ ”البدْر“ لاک ڈاؤن کی زد میں آکر ”پابند سلاسل“ نہ ہوا ہوتا تو ان مضامین کی اس میں اشاعت ہو جاتی۔ اس لئے ان میں کے بیشتر مضامین کو لکھ لکھ کر اپنے پاس اس امید پر کہ ”یہ وقت بھی گزر جائے گا“ اور جب ان شاء اللہ ”البدْر“ کی اشاعت بحال ہوگی تو اس میں انہیں شائع کیا جائے گا۔ اپنے پاس محفوظ کرتے رہنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا؟ — اسی دوران میرے فرزند ان مفتی حارث عبد الرحیم قاسمی اور مولوی معاویہ عبد الرحیم ندوی نے یہ بھجایا کہ کیوں نہ ان مضامین کو کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے؟ جب اس کا ذکر آیا تو دوسرے کئی احباب نے بھی تائید کی — اور پھر جب میرا ذہن بھی اس پر آمادہ ہو گیا تو خیال آیا کہ اس سلسلہ کے ایسے بھی کئی مضامین ہیں جن کی اشاعت ”لاک ڈاؤن“ سے پہلے ”البدْر“ یا کسی دوسری جگہ ہو چکی ہے، انہیں بھی کتاب میں شامل کر لیا جائے تو محفوظ ہو جائیں گے — اور ۔

خاک میں مل جائے گا جب میری ہستی کا نشان

تازہ ہوگی یادِ گارِ زیست اس تحریر سے

مضامین کی ترتیب کے بعد کتاب کا نام رکھنے کا مرحلہ آیا۔ کئی نام تجویز

ہونے کے بعد بالآخر یہ مناسب معلوم ہوا کہ اس کتاب کا نام ”اکثر یاد آتے ہیں“ رکھا جائے، جب کہ اسی موضوع پر اب سے کئی برس پہلے میری ایک دوسری کتاب ”میں نے بھی جنہیں دیکھا ہے“ کے نام سے شائع ہو کر قارئین سے پسندیدگی کی سند حاصل کر چکی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس میں زیادہ تر عظیم القدر و لائق احترام شخصیات کا ذکر ہے، جب کہ زیر نظر کتاب میں بیشتر ”میری محبوب“ شخصیات کا ذکر ہے اور عظمت و احترام ان کی اضافی صفات ہیں، انتخاب کی بنیاد نہیں؟۔

ہمیں جتنا یقین اس بات کا ہے کہ اس کتاب میں جن شخصیات کا ذکر ہے ان سب ہی سے بہت کم قارئین کو مناسبت و دلچسپی ہوگی۔ اتنا ہی اس بات کا بھی یقین ہے کہ اردو زبان و ادب کا کوئی قاری شاید ہی ایسا ہو کہ جس کی کسی نہ کسی پسندیدہ یا کسی بھی حوالہ سے رابطہ میں آنے والی شخصیت کا اس کتاب میں ذکر نہ ہو؟ اس طرح میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ دین و ادب اور اردو زبان کے ہر قاری کے لئے اس کتاب میں کچھ نہ کچھ دلچسپی کا سامان ضرور ہے — لیکن شرط یہ ہے کہ کم از کم فہرست مضامین ہی کو غور سے پڑھ لیا جائے؟؟۔

کتاب کے مصنف و مرتب کو اپنے بارے میں نہ کوئی غلط فہمی ہے نہ ہی اپنی بے ربط و ٹوٹی پھوٹی تحریر میں کسی جاذبیت و چاشنی کا گمان — وہ تو اپنے قلبی واردات کو ضبط تحریر میں لا کر قارئین کے سامنے پیش کرتے ہوئے اپنے کو مخاطب کر کے صرف اتنا کہنا چاہتا ہے کہ ۔

☆ ترا سیدھا سادا بیان ہے ☆ تری ٹوٹی پھوٹی زبان ہے
☆ ترے پاس ہیں یہی ٹھیکرے ☆ تو محل ان ہی سے بنائے جا

عبدالعلی فاروقی

ابراہیم منزل، پائٹانالہ، لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۰۳

۲۳ دسمبر ۲۰۲۰ء مطابق ۷ جمادی الاولیٰ ۱۴۴۲ھ

بسم الله الرحمن الرحيم

Mohammad Rabey Hasani Nadwi

P.O. Box No. 93, Lucknow-226007 (INDIA)
Phones : (0522) 2740151, 2741316 Fax : 2741231
E-mail : rabeynadwi@yahoo.com

محمد الربیع الحسنی (ندوی)

ندوة العلماء ص۔ ب۔ ۹۳ لکھنؤ (الہند)

الترغیب

بسم الله الرحمن الرحيم
مقدمہ

الترغیب

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد المرسلين وخاتم النبيين سيدنا محمد بن عبد الله الأمين، وعلى آله وصحبه أجمعين، وعلى من تبعهم بإحسان ودعا بدعوتهم إلى يوم الدين وبعد!

انسان کی سیرت کی تشکیل میں اس کے سرپرستوں اور قریبی رفقاء کی صحبت کا گہرا اثر ہوتا ہے، اس لیے لوگوں کی صحبت کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے، اور اس کا اہتمام کیا جاتا ہے، چنانچہ جس کو گہری صحبت ملے، وہ آسانی سے اچھا انسان بن جاتا ہے، اس کی صلاحیتوں کو اچھی مدد ملتی ہے، اصل فائدہ تو براہ راست صحبت کے حالات و کمالات سے واقفیت بھی براہ راست صحبت کے فائدہ کی قائم مقام بنتی ہے، اس لیے شخصیتوں کی سوانح اور تذکروں سے اچھا فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

دنیا کی مختلف زبانوں میں سوانح اور تذکروں کا بڑا سرمایہ موجود ہے، تذکرہ اور سوانح نگاروں نے اہل فضل و کمالات کی زندگیوں کو آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا ہے، تاکہ وہ ان کے سیرت و کردار سے واقف ہوں اور اپنی زندگیوں کو صحیح خطوط پر استوار کر سکیں۔

شخصیات کے تعارف میں طویل مقالات اور تحقیقی مضامین کے مقابلہ میں مختصر تذکروں اور خاکوں کو ہمیشہ فوقیت دی گئی ہے، اور آج کے اس مشینی دور میں جب ہر شخص مصروف عمل ہے، مختصر تذکروں کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے، تذکرہ کے لیے شخصیات کے انتخاب میں اگر یہ کیا جائے کہ تذکرہ نگار کے ذوق و مزاج اور رجحان کا بڑا اثر ہوتا ہے تو غلط نہ ہوگا، عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ تذکرہ نگار انہی شخصیات کو منتخب کرتا ہے، جن سے اس کو بڑی بات لگا رہے ہوں، فکری ہم آہنگی ہوتی ہے، مزاج اور طبیعت میں یکسانیت ہوتی ہے اور جن کا تذکرہ دوسروں کے لیے مفید اور کارآمد سمجھتا ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس عہد اور عہد کے مسائل اور تقاضوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، حوصلہ ملتا ہے، ہمت بڑھتی ہے اور کام کی کیفیت میں دلچسپی آتی ہے۔

پیش نظر کتاب "اکثر یاد آتے ہیں" مختلف حیثیتوں سے ممتاز اور مختلف میدانوں کی منتخب شخصیتوں کا مجموعہ ہے جو اپنے انتخاب اور اختصار میں اہمیت کا حامل ہے، اس تذکرہ کی اہمیت اس لیے بڑھ جاتی ہے کہ یہ ایک معروف صاحب علم مولانا عبدالحی فاروقی صاحب کے قلم سے ہے جنہیں لکھنے کا اچھا سلیقہ ہے، اس مجموعہ میں مختلف ذوق و رجحان والے قارئین کو اپنے ذوق کی تسکین اور دلچسپی کا سامان ملے گا کہ اس میں عالم و مصنف بھی ہیں، شاعر و ادیب بھی، فقیر و درویش بھی، سیاست و خدمت ملی کے میدان کے شہسوار بھی، بزرگ بھی، دوست بھی، نامور بھی، گمنام بھی۔ ہم امید کرتے ہیں کہ یہ مجموعہ مفید ثابت ہوگا اور اس سے اہل فضل و کمالات کی خدمات و خصوصیات سے واقفیت حاصل ہوگی، اور اس سے ضروری فائدہ حاصل کیا جائے گا، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ (آمین)

(محمد ربیع الحسنی ندوی)
چشم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱۶ جنوری ۱۴۳۳ھ

۱۱ دسمبر ۲۰۱۱ء

رئيس ندوة العلماء، ورئيس هيئة الأحوال الشخصية الإسلامية لعموم الهند، وعضو المجلس التأسيسي لرابطة العالم الإسلامي بمكة المكرمة ونائب رئيس رابطة الأديب الإسلامي، ورئيس المجمع الإسلامي العلمي، ورئيس المجلس التعليمي البني، وعضو مركز أوكسفورد للدراسات الإسلامية Nazim (Rector) Nadwi Ullama, President All India Muslim Personal Law Board, Member World Muslim League Mahkai, Vice President Universal League for Islamic Literature, President Academy of Islamic Research & Publication, President Deeni Taleemi Council, Member Oxford Center for Islamic Studies - Oxford (U.K.)

مقدمہ

حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی، ناظم ندوة العلماء لکھنؤ و صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين وخاتم النبيين سيدنا محمد بن عبد الله الأمين، وعلى آله وصحبه أجمعين، وعلى من تبعهم بإحسان ودعا بدعوتهم إلى يوم الدين وبعد!

انسان کی سیرت کی تشکیل میں اس کے سرپرستوں اور قریبی رفقاء کی صحبت کا گہرا اثر ہوتا ہے، اس لیے لوگوں کی صحبت کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے، اور اس کا اہتمام کیا جاتا ہے، چنانچہ جس کو اچھی صحبت ملتی ہے، وہ آسانی سے اچھا انسان بن جاتا ہے، اس کی صلاحیتوں کو اچھی مدد ملتی ہے، اصل فائدہ تو براہ راست صحبت کا ہوتا ہے، لیکن شخصیات کے حالات و کمالات سے واقفیت بھی براہ راست صحبت کے فائدہ کی قائم مقام بنتی ہے، اس لیے شخصیتوں کی سوانح اور تذکروں سے اچھا فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

دنیا کی مختلف زبانوں میں سوانح اور تذکروں کا بڑا سرمایہ موجود ہے، تذکرہ اور سوانح نگاروں نے اہل فضل و کمالات کی زندگیوں کو آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا ہے، تاکہ وہ ان کے سیرت و کردار سے واقف ہوں اور اپنی زندگیوں کو صحیح خطوط پر استوار کر سکیں۔

شخصیات کے تعارف میں طویل مقالات اور تحقیقی مضامین کے مقابلہ میں مختصر تذکروں اور خاکوں کو ہمیشہ فوقیت دی گئی ہے، اور آج کے اس مشینی دور میں جب ہر شخص مصروف عمل ہے، مختصر تذکروں کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے، تذکرہ کے لیے شخصیات کے انتخاب میں اگر یہ کیا جائے کہ تذکرہ نگار کے ذوق و مزاج اور رجحان کا بڑا اثر ہوتا ہے تو غلط نہ ہوگا، عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ تذکرہ نگار انہی شخصیات کو منتخب کرتا ہے، جن سے اس کو بڑی بات لگا رہے ہوں، فکری ہم آہنگی ہوتی ہے، مزاج اور طبیعت میں یکسانیت ہوتی ہے اور جن کا تذکرہ دوسروں کے لیے مفید اور کارآمد سمجھتا ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس عہد اور عہد کے مسائل اور تقاضوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، حوصلہ ملتا ہے، ہمت بڑھتی ہے، اور کام کی کیفیت میں دلچسپی آتی ہے۔

پیش نظر کتاب "اکثر یاد آتے ہیں" مختلف حیثیتوں سے ممتاز اور مختلف میدانوں کی منتخب شخصیتوں کا مجموعہ ہے جو اپنے انتخاب اور اختصار میں اہمیت کا حامل ہے، اس تذکرہ کی اہمیت اس لیے بڑھ جاتی ہے کہ یہ ایک معروف صاحب علم مولانا عبدالحی فاروقی صاحب کے قلم سے ہے جنہیں لکھنے کا اچھا سلیقہ ہے، اس مجموعہ میں مختلف ذوق و رجحان والے قارئین کو اپنے ذوق کی تسکین اور دلچسپی کا سامان ملے گا کہ اس میں عالم و مصنف بھی ہیں، شاعر و ادیب بھی، فقیر و درویش بھی، سیاست و خدمت ملی کے میدان کے شہسوار بھی، بزرگ بھی، دوست بھی، نامور بھی، گمنام بھی۔ ہم امید کرتے ہیں کہ یہ مجموعہ مفید ثابت ہوگا اور اس سے اہل فضل و کمالات کی خدمات و خصوصیات سے واقفیت حاصل ہوگی، اور اس سے ضروری فائدہ حاصل کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ (آمین)

محمد رابع حسنی ندوی
ناظم ندوة العلماء لکھنؤ

۱۶ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ، ۱۱ دسمبر ۲۰۱۱ء

میری امّاں — یعنی — میری نانی؟

میں نے اپنی ایک کتاب ”میں نے بھی جنہیں دیکھا ہے“ کا انتساب کچھ یوں کیا تھا:

”اس صبر و شکر کی پیکر خاتون کے نام جس نے مجھ پر اپنی محبت کے ڈونگرے لٹاتے ہوئے بھی اپنے ذوق عبادت کی تسکین کا سامان اس طرح کیا کہ ہر مشکل گھڑی اور ہر تعلیمی امتحان کے موقع پر اس نے مجھے نماز حاجت پڑھ کر رخصت کیا، اور میری کامیابی کا استقبال نماز شکرانہ ادا کر کے کیا — کیوں کہ وہ بڑے اعتماد و یقین کے ساتھ اور بڑے پرسوز انداز میں یہ شعر گنگنایا کرتی تھیں کہ —
ضائع نہ جائے گی کبھی محنت نماز کی
اللہ دینے والا ہے اجرت نماز کی
یعنی

نانی محترمہ وافیہ خاتون کے نام — جنہیں میں نے ہمیشہ امّاں کہہ کر ہی مخاطب کیا — اور شدید چاہت کے باوجود ان کا تذکرہ یہ سوچ کر میں اس کتاب میں شامل نہیں کر سکا کہ دوسروں کے لئے ان کے تذکرہ میں دلچسپی کا کیا سامان؟

— وہ تو بس میری امّاں تھیں —

زندگی ہے نام جہد و جنگ کا
موت کیا ہے بھول جانا چاہئے“

اس کتاب کا مطالعہ کرنے والے میرے کئی باذوق احباب نے مجھ سے کہا کہ تم نے اپنے ”انتساب“ میں اپنی نانی صاحبہ کا کوئی تفصیلی تذکرہ نہ کر کے بھی کچھ ایسا ان کے بارے میں لکھ دیا کہ اب ان کے کچھ تفصیلی حالات لکھنا بھی تم پر لازم ہو گیا ہے — مجھے یہ سن کر واقعی اچھا لگا تھا کہ میری نانی مرحومہ جنہیں میں واقعی بس ”اپنی امّاں“ ہی کی حیثیت سے جانتا، چاہتا، اور کبھی شدت سے ان کی یاد آنے پر دو آنسو بہا کر ان کے لئے دعائے مغفرت کر لیا کرتا تھا — دوسرے بھی ان کے کچھ حالات زندگی جاننے کے طلب گار نظر آئے؟ میں نے احباب کی اس پذیرائی پر وعدہ بھی کر لیا کہ ہاں کچھ لکھوں گا — اور پھر بات آئی گئی ہوگئی۔

کم و بیش تین برس کے بعد میری ایک اور نئی کتاب ”یادوں کے جھروکوں سے“ کی رسم اجراء کے لئے میرے عزیز و قدر داں وصی صدیقی بانی جنرل سکریٹری ”محمد علی جوہر فاؤنڈیشن“ لکھنؤ نے اپنے دفتر میں ایک محفل سجائی، جس میں انہوں نے اپنے حلقہ احباب اور میرے کرم فرماؤں کو اتنی بڑی تعداد میں جمع کر لیا کہ منظر کسی کتاب کے ”رسم اجراء“ کا نہیں، بلکہ کسی باقاعدہ اعلان شدہ جلسہ کا تھا؟ — پھر یہ مجمع عوام کا نہیں بلکہ خواص کا تھا، جس میں علمائے کرام، شعرائے عظام، اور ادیب و دانشور سب ہی شامل تھے۔

بہت باوقار انداز میں اور بہت معتبر ہاتھوں سے کتاب کی ”رسم اجراء“ انجام پائی — اور روایتی طور پر کتاب، نیز کتاب کے مصنف کے سلسلہ میں کچھ منتخب حضرات نے اپنی آراء کا اظہار کیا — ان اظہار رائے کرنے والوں میں ایک میرے بہت ہی قابل احترام کرم فرما مولانا پروفیسر شبیر احمد

ندوی (سبکدوش صدر شعبہ عربی لکھنؤ یونیورسٹی) بھی تھے۔ جنہوں نے میری ذات اور میری اس کتاب کے بارے میں تو جو کچھ کہا اسے میں ”خرد نوازی“ اور حوصلہ افزائی سے تعبیر کرنے پر مجبور ہوں — کیوں کہ میں نے خوب دیکھا اور بتا ہے کہ باوقار بڑے، اسی طرح اپنے خردوں کو آگے بڑھا کر کام پر لگاتے ہیں — لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ آں موصوف نے میری پچھلی کتاب ”میں نے بھی جنہیں دیکھا ہے“ کے حوالہ سے ”نانی مرحومہ“ پر تفصیل کے ساتھ کچھ لکھنے کی باصرہ فرمائش کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ

”مولانا..... نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ اگر وہ ان کی اماں ہیں تو ان بلند کردار خاتون کے حالات جاننے کا دوسروں کو حق نہیں ہے؟“

اور پھر ہوا یہ کہ ڈاکٹر صاحب موصوف کی اس بات کی اسٹیج پر پرزور تائید ہو گئی، اور اسٹیج سے لے کر اسٹیج کے بعد تک ڈاکٹر صاحب سمیت متعدد لوگوں نے کچھ اس خلوص و پیار کے ساتھ مجھ سے اس کام کو انجام دینے کے لئے اصرار کیا کہ میں نے ”اظہار جذبات“ سے زیادہ ایک نیک کام سمجھ کر اسے انجام دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اور مجھے اس بات پر یقین کرنا پڑا کہ —
محبت کرنے والا زندگی بھر کچھ نہیں کہتا
کہ دریا شور کرتا ہے سمندر کچھ نہیں کہتا

میں نے اپنے نانا صاحب کو نہیں دیکھا۔ انہیں تو میری والدہ مرحومہ نے بھی دیکھنے کی طرح نہیں دیکھا تھا، کہ اپنی ماں (نانی صاحبہ) کی یہ اکلوتی بیٹی ابھی صرف دو ماہ کی تھی کہ سایہ پدری سے محروم ہو گئی اور میری نانی صاحبہ بھری جوانی میں جب کہ ان کی عمر ابھی صرف ۱۹ سال تھی، بیوہ ہو گئیں۔

میں نے آنکھ کھول کر نانی صاحبہ کو اپنے ساتھ اپنے ہی گھر میں دیکھا — اور نہ صرف دیکھا، بلکہ ان کی گود میں پلا بڑھا، اور ان کی شمر بار دعاؤں

کے زیر سایہ پروان چڑھا۔ کیوں کہ بیوہ ہونے کے بعد انہوں نے اپنے مرحوم شوہر کی امانت، یعنی اپنی گود میں موجود صرف دو ماہ کی بچی کی پرورش و پرداخت کی خاطر دوبارہ نکاح کر کے اپنا گھر پھر سے آباد نہ کرنے کا قطعی اور حتمی فیصلہ کر لیا تھا۔ والد حیات تھے، وہ اپنی جوانی میں بیوہ بنی کو اپنے گھر لے آئے، یہاں سوتیلی ماں اور بھائی بہنوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا، ہر طرح دل جوئی کرنے کے ساتھ ہی وقتاً فوقتاً دوبارہ گھر آباد کرنے پر اصرار بھی کیا۔ مگر نانی مرحومہ اپنے ”فیصلہ“ پر قائم رہیں — حتیٰ کہ ان کے والد کی وفات ہو گئی، ان کی لاڈلی بیٹی نے ان کی آغوش محبت میں پل کر جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ دیا، اور ابھی اس کی عمر صرف چودہ برس کی ہوئی تھی کہ انہوں نے میرے والد ماجد کے ساتھ عقد کر کے اپنے فرض سے سبکدوشی حاصل کر لی۔

اور پھر کچھ عرصہ کے بعد والد صاحب، نانی صاحبہ کو بھی ان کی اکلوتی بیٹی ہی کے پاس لے آئے جس کی خاطر انہوں نے اپنی جوانی، اور جوانی کے سارے ارمانوں کو تھج دیا تھا — یہ سب کچھ میرے اس عالم آب و گل میں آنکھ کھولنے سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ میں نے تو نانی صاحبہ کی آغوش کو اپنی اماں کی آغوش سمجھ کر پرورش پائی۔ دو بڑی بہنوں کی موجودگی اور ایک بڑی بہن اور بڑے بھائی کی کم سنی ہی میں موت ہو جانے کی وجہ سے میرے چاؤ چوپلے کچھ زیادہ ہی تھے، اس پر مستزاد اماں کی آغوش نے مجھے اور بھی ”خاص الخاص“ بنا دیا تھا۔

میں نے ”اپنی اماں“ کو صبر و شکر کا پیکر لکھا — تو بہت سوچ سمجھ کر لکھا۔ ماں کی آغوش رحمت سے بہت کم سنی ہی میں محروم ہو گئیں۔ باپ نے ان کی شادی کر کے اپنے گھر والا بنایا تو بھری جوانی میں سہاگ اجڑ گیا، شوہر کی یادگار ایک دودھ پیتی بچی کو لے کر باپ کے گھر پھر پلٹ کر آئیں تو سایہ پدری بھی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا — ایک ایک کر کے دنیا کے عارضی سہارے ٹوٹے تو رحمت خداوندی نے سہارا بن کر انہیں اپنی آغوش میں لے

لیا۔ اور جب یہ پائیدار ولا زوال سہارا ملا تو وہ بس اسی کی ہو کر رہ گئیں۔
ایک بیٹی کی ذات سے انہیں اللہ تعالیٰ نے بھرا پراکنبہ عطا کیا۔ تین
نواسیوں اور چار نواسوں میں سے تین کے گھر آباد ہوتے ہی نہیں دیکھا، بلکہ ان
کے بچوں کو کھلا پلا کر ان میں سے کئی کی شادی بیاہ بھی دیکھی۔ صرف ایک سب
سے چھوٹے نواسہ عبدالوحید سلمہ کا گھر ان کے انتقال کے بعد آباد ہوا۔

میرا معاملہ سب سے مختلف رہا، کیوں کہ وہ اپنی تمام نواسیوں، نواسوں،
اور ان کی اولاد کی نانی تھیں، جب کہ صرف اپنی بیٹی یا پھر میرے لئے ”میری
اماں“ تھیں۔ مجھ سے صرف پونے دو سال بڑی بہن ”ہماری امی“ کی گود میں
تھیں، اس لئے بچپن سے ہی ”میری اماں“ مجھے اپنے پاس ہی سلاتی تھیں۔
میری پڑھائی کا سلسلہ شروع ہوا تو جتنی دیر میں اپنا سبق یاد کرتا، میری اماں
میرے بغل میں بیٹھ کر پکھا جھلا کرتی تھیں۔ میرے حفظ کے استاذ حافظ سید علی
صاحب مرحوم مجھے ٹیوشن کے طور پر پڑھانے کے لئے بھی آتے تھے۔ میرے
حافظ جی بے حد مشفق تھے لیکن پڑھائی کے معاملہ میں کسی سمجھوتہ کو روا نہیں رکھتے
تھے، وہ بڑے فخر کے ساتھ کہتے تھے کہ ”میں رانگا نہیں لوہا بناتا ہوں“ اور یہ لوہا
بنانے کے لئے وہ اپنے بچوں (شاگردوں) کے جسموں کو بھی اپنی ضربوں کے
ذریعہ لوہا بنانا ضروری سمجھتے تھے؟ چوں کہ اس دور میں یہ تصور عام تھا کہ حفظ
قرآن کے لئے مار پیٹ لازمی ہوتی ہے۔ اس لئے والدین اپنے حفظ کرنے
والے بچوں کو یہ سمجھ کر اساتذہ کے حوالہ کرتے تھے کہ بچوں کو اپنے استاذوں کی
مار بھی کھانا ہے؟ میرے حافظ جی پڑھانے آتے تو میں گھر کے بالکل متصل مسجد
میں پڑھنے کے لئے چلا جاتا، اور ”میری اماں“ گھر کی اس کھڑکی پر جو مسجد کے
رخ پر تھی، بیٹھ کر دعا میں مشغول ہو جاتیں کہ ”اے میرے اللہ! میرا بچہ صحیح
سنادے، اس کا سبق اور آموختہ خوب پکا یاد نکلے، وہ ”سید علی“ کے ہاتھ کی مار نہ
کھائے..... اس دوران اگر میری پٹائی ہوتے ہوئے ”میری اماں“ دیکھ

لیتیں، یا میرے رونے چلانے کی آوازیں لیتیں، تو بے چین ہو کر کھڑکی پر سے
ہٹ جاتیں، اور آنسو بہا بہا کر میرے لئے ”نجات“ کی دعا کرتی رہتیں
— کوئی پوچھ لیتا کہ کیا بات ہے؟ کیوں رو رہی ہیں؟ تو جواب میں بہت
ہی بے چارگی کے ساتھ جھجھلائے ہوئے لہجہ میں کہتیں ”ارے سید علی ظالم
میرے بچے کو مارے ڈال رہا ہے“۔ میری والدہ اگر انہیں سمجھانے کی کوشش
میں کہتیں کہ ”اماں! وہ ظالم نہیں ہیں، آپ ہی کے بچے کی بھلائی کیلئے تنبیہ کرتے
ہیں، بچہ جب یاد کر کے نہیں سنائے گا تو مار تو کھائے گا ہی“ — والدہ کی یہ
”فہمائش“ ”کٹے پر مرچ“ کا کام کرتی، اور اماں پھر کر اپنی بیٹی سے کہتیں
”ارے تو ماں نہیں، ڈائن ہے۔ تیرے دل میں نہ خدا کا خوف ہے، نہ بچہ کی
محبت ہے۔ ابھی اس کی کیا بساط ہے؟ (میرا حافظہ بہت ہی کم عمری میں جب کہ
میری عمر ۸ سال کی تھی مکمل ہو گیا تھا) ننھی سی جان کو اس ظالم کے ہاتھوں ہلاک
کر ادینا چاہتی ہے؟ بھائی صاحب (یعنی میرے دادا صاحب مرحوم) کا شوق
وارمان نہ ہوتا تو اپنے بچہ کو حافظہ کرنے کے لئے کبھی نہ داخل ہونے دیتی
— ارے ننھی سی جان پر اتنا بوجھ اور اتنا ظلم، اور یہ ”سنگدل ماں“ ہے جو
خوشی خوشی سب برداشت کر رہی ہے؟

ایک طرف تو یہ ہوتا، اور پھر دوسری طرف جب مجھے سبق یاد کرانے کے
لئے لے کر بیٹھتیں تو کیسے کیسے چاؤ اور پیار سے مجھے سمجھاتیں کہ میرے بچے،
کوئی تمہارا دشمن تھوڑی ہے، جی لگا کر پڑھو جلدی سے یاد کر لو، میرا بچہ حافظ
قرآن بنے گا، اس کی پگڑی بندھے گی، خوب دھوم دھام سے دعوت ہوگی، پھر
قیامت کے دن اللہ میاں اس سے اتنا خوش ہوں گے کہ ماں باپ، دادا دادی،
نانا نانی، سب کو بادشاہوں والے ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تاج پہنائے گا
..... وغیرہ وغیرہ۔

میری اماں کا جب ۱۹۹۳ء میں انتقال ہوا تو میرے ساتوں بیٹوں،

بیٹیوں کی پیدائش ہو چکی تھی، بلکہ ماشاء اللہ بڑے بچے تو جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ میں اگر بوڑھا نہیں تو ”ادھیڑ“ ضرور ہو چکا تھا — اس کے باوجود میرے کھانے پینے سے لے کر میری بیوی بچوں کی طرف سے ”میری اماں“ اس طرح فکر مند رہیں جیسے کوئی ماں اپنے کم سن بچہ کے لئے رہتی ہے، گھر سے مدرسہ کے لئے روانگی ہو، یا کسی سفر پر جانا ہو، کوئی تعلیمی امتحان دینا ہو، یا رمضان میں تراویح میں قرآن مجید سنانے کے لئے مسجد جانا ہو — میں سب سے آخر میں اپنی اماں کو بتا کر اور ان کی دعائیں لیتا ہوا ہی رخصت ہوتا تھا۔ اماں کو گھڑی سے ٹائم دیکھنا نہیں آتا تھا، مگر وہ گھر کے دیگر افراد سے پوچھ پوچھ کر واپسی کے مقررہ وقت سے کچھ پہلے ہی سے میرا انتظار کرنے لگتی تھیں۔ کسی دن کوئی عذر پیش آ جانے کی وجہ سے واپسی میں تاخیر ہو جاتی تو اماں بے چین ہو جاتی تھیں — کبھی کچھ زیادہ ہی دیر ہوتی تو اماں نماز شکرانہ مان کر، اور تسبیح ہاتھ میں لئے ٹہل ٹہل کر بڑی ہی بے قراری کے ساتھ اپنے رب سے لو لگا کر، میری خیر و عافیت سے واپسی کے لئے نہ جانے کس کس طرح بھیک مانگتی رہتیں — اور جب واپس آ کر انہیں سلام کرتا تو مجھے دیکھ کر وہ یکدم پھر جاتیں — کہاں رہ گئے تھے؟ کیوں مجھے ستاتے ہو؟ کیا میری جان کے دشمن بن گئے ہو؟ تم میری جان لے کر سدھرو گے؟ — خوشی کے آنسو بہاتے ہوئے اپنی رو میں اماں میرا کوئی عذر سننے کو روادار نہ ہوتیں — بالآخر تھک ہار کر مجھے تو کھانے پینے اور آرام کرنے کے لئے بھیج دیتیں اور خود مصلیٰ بچھا کر شکرانہ ادا کرنے میں مصروف ہو جاتیں۔ نماز سے تو انہیں عشق کی حد تک محبت ہی نہیں تھی، بلکہ وہ اپنے خالق و مالک سے ”اپنی منوائے“ کے لئے بڑے اعتماد اور بھرم کے ساتھ بہ طور ”ہتھیار“ نماز کا استعمال کرتی تھیں۔ پنج گانہ نمازوں کے ساتھ ہی تہجد، صلوٰۃ التسبیح، اشراق، چاشت، اور اوابین کی ادائیگی پابندی کے ساتھ روز کا معمول تھا۔ ذکر واذکار اور

تسبیح گردانی کی کثرت کا عالم یہ تھا کہ جب تسبیح کے دانے گھس کر اتنے چھوٹے ہو جاتے کہ ان کی چٹکی میں نہ آ پاتے تو انہیں دوسری نئی تسبیح دے دی جاتی۔ میں نے ایک مرتبہ ریڈیم کے بڑے دانوں کی تسبیح انہیں یہ بتا کر دی کہ ایک حاجی صاحب نے لا کر دی ہے تو اس تسبیح کو پا کر وہ ایسا خوش ہوئیں اور مجھے نیز تسبیح لانے والے حاجی صاحب کو اس طرح منہ بھر کر دعائیں دیں کہ میں اس منظر کو تا عمر فراموش نہیں کر سکتا۔ پھر اسی وقت نہیں، بلکہ رات کے اندھیرے میں جب جب وہ چمکتے ہوئے دانوں کی تسبیح ہاتھ میں لیتیں تو اپنا ذکر واذکار شروع کرنے سے پہلے ہمیں دعائیں دینا نہیں بھولتی تھیں۔

کبھی کبھی رات کے پچھلے پہر میری آنکھ کھلتی اور اپنی اماں کو نہایت ہی سوز و گداز کے ساتھ بلند آواز میں اپنے رب سے ٹپ ٹپ کر یوں مانگتے سن لیتا کہ —

رحم کر اپنے نہ آئین کرم کو بھول جا
ہم تجھے بھولے ہیں یا رب تو نہ ہم کو بھول جا

تو میری نیند اچٹ جاتی اور میں گھبراہٹ کے عالم میں اٹھ کر بستر پر بیٹھ جاتا، اور اپنی اماں کو روتے دھوتے دیکھ کر کچھ سمجھ بغیر چپکے چپکے خود بھی آنسو بہانے لگتا۔ ”عالم وارفتگی“ سے واپس آ کر اماں کی مجھ پر نگاہ پڑتی تو وہ مصلیٰ چھوڑ کر میرے پاس آ جاتیں۔ اور میں جب پوچھتا کہ اماں کیوں رورہی تھیں؟ تو وہ میری بساط کی رعایت کرتے ہوئے بس اتنا کہہ دیتیں کہ ”کچھ یاد آ گیا تھا“ اور میرے آنسو پوچھتے ہوئے مجھے دلا سہ تسلی دے کر پھر سلا دیا کرتی تھیں؟

مجھے بہت ہی شرمندگی کے ساتھ اپنی اس ناقدری اور محرومی کا اعتراف کرنا پڑ رہا ہے کہ میں نے اپنی اماں کو پا کر، ان کی گود میں پل کر، اور ان کی دعاؤں سے بہت کچھ پا کر بھی انہیں پہچانا نہیں۔ ان کی ناز برداریوں اور لاڈ و پیار سے میں اتنا بگڑ گیا کہ میں نے بس اتنا ہی سمجھا اور برتا کہ وہ ”میری اماں“

ہیں، اور بس! حالانکہ اب ان کے اپنے رب سے مضبوط و مستحکم رشتے، اور دنیا اور متاع دنیا سے بقدر کفاف تعلق پر غور کرتا ہوں تو ایک یقین سا ہو جاتا ہے وہ ”خدا رسیدہ بزرگ“ کا صحیح مصداق تھیں۔ حالانکہ مجھے یاد ہے کہ میری ایک رشتہ کی پھوپھی مرحومہ نے (جو خود بھی بہت پابند اوقات تھیں) کئی مرتبہ ہم بھائی بہنوں کو مخاطب کرتے ہوئے یہ چتاؤنی بھی دی کہ تم لوگ اپنی نانی صاحبہ کو سمجھ نہیں پا رہے ہو، وہ بہت ہی اللہ والی اور بزرگ ہیں، جب وہ نہیں رہیں گی تب تم لوگ یاد کرو گے؟ اس کے باوجود ہماری غفلتوں کے پردے نہیں ہٹے — مرحومہ پھوپھی صاحبہ تو موقع بہ موقع صرف اماں ہی سے ملنے کے لئے آتیں، چپکے چپکے ان سے باتیں بھی کرتی جاتیں، اور ان کے ہاتھ پیر بھی دباتی جاتیں، اور پھر ان سے دعائیں لے کر ہم لوگوں سے ”واجبی دعا سلام“ کرتی ہوئی اپنے گھر واپس چلی جاتیں — لیکن مجھے اپنی ”آوارہ مزاجی و ناقدری“ نے یہ سب کرنے کا کبھی موقع نہیں دیا — اور اب جب یہ حسرت ناکام انگڑائیاں لیتی ہے کہ ع

لوٹ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

تو بے ساختہ اپنا ہی ضمیر ملامت کرتے ہوئے زوردار طمانچہ رسید کر کے کہہ دیتا ہے کہ ع

چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی؟

میری اماں نے ۱۸ جولائی ۱۹۹۳ء کو اپنی زندگی کی آخری سانس لی تو فجر کی اذان ہو رہی تھی، وہ بالکل چت لیٹی تھیں اور ان کے دونوں ہاتھ سینے پر اس طرح تھے جیسے نماز ادا کر رہی ہوں۔ ان کے داہنے ہاتھ کی شہادت والی انگلی اوپر اٹھی ہوئی تھی اور ان کی ہر وقت کی ساتھی ”ان کی تسبیح“ بائیں بازو میں پڑی ہوئی تھی — اور ہم سب ان کی چارپائی کے اگل بغل کھڑے ان کے نواسی نواسے، اور ان کی دنیا کی کائنات ان کی اکلوتی بیٹی، ان کی روح نفیس عنصری

سے پرواز ہوتے دیکھ کر یہی سوچنے اور کہنے پر مجبور تھے کہ —

نشان مرد مومن با تو گویم

چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

میری اماں اپنے پیچھے بھرپور اکنہ چھوڑ کر گئیں۔ ان کے انتقال کے وقت ان کی ایک لڑکی کی ذات سے ان کے تیرہ نواسے اور پر نواسے حافظ قرآن گھر ہی میں موجود تھے۔ میں نے گھر میں موجود سب مردوں عورتوں کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ کسی کا رونا دھونا ان کے کام نہیں آئے گا۔ محبت ہو تو قرآن مجید کی تلاوت، اور کلمہ طیبہ کی تسبیح پڑھ کر ان کے لئے ایصال ثواب کرو — ۱۲ بجے دن میں کاکوری کے آبائی قبرستان میں تدفین کے لئے ان کا جنازہ اٹھایا گیا تو بفضلہ تعالیٰ ذکر و اذکار کے علاوہ دو قرآن مکمل پڑھ کر ان کے لئے ایصال ثواب کیا جا چکا تھا۔ امید کہ حق تعالیٰ نے ضرور شرف قبول بخشا ہوگا۔

میری اماں کی اصل میراث یہی تھی، جس نے بفضل اللہ تعالیٰ ان کے بعد اور بھی ترقی کی ہے — ویسے اماں کے بعد ان کی ٹین کی چھوٹی سی پیٹی کھول کر ”متاع دنیا“ سے ان کی میراث تلاش کی گئی تو منظر کچھ یہ تھا کہ —

چند تصویر بتاں، چند حسینوں کے خطوط

بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

میں احسان مند ہوں اپنے مالک و خالق کے بعد اپنے والدین کریمین، اپنی پھوپھیوں پھوپھاؤں، اپنے تمام بھائی بہنوں، اور اپنے تمام چھوٹوں بڑوں کا بھی، اور اپنے مشفق اساتذہ کرام کا بھی کہ اپنی کسی کارگزاری یا صلاحیت کے بغیر ہر ایک سے مجھے بے پناہ محبتیں بھی ملیں اور دعائیں بھی — مگر محبت اور دعاؤں کا وہ انداز جو ”میری اماں“ سے مجھے حاصل ہوا، وہ تو ”میری اماں“ کے اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد پھر نہ مل سکا کہ میں ذرا گنیمت لہجہ میں سنجیدگی کے ساتھ انہیں اپنی کوئی مشکل یا پریشانی بتا کر ان سے دعا کے لئے کہتا تو فوراً دعا

کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہوئے نماز شکرانہ بھی مان لیتیں — اور اپنے رب پر بھروسہ کر کے کچھ ایسے پراعتماد لہجہ میں مجھے ڈھارس بندھائیں کہ مجھے اسی وقت یقین سا ہو جاتا کہ ”میرا مسئلہ حل ہو گیا“۔

اور اب بشیر بدر کے الفاظ میں حال یہ ہے کہ ۔

میری آنکھوں سے ترے پیار کا آنسو آئے

کوئی خوشبو میں لگاؤں تری خوشبو آئے

مناسب ہوگا کہ آخر میں وہ مختصر تعزیتی تحریر بھی شامل کر لی جائے جو اماں کی وفات کے فوراً بعد ”البدر“ کے شمارہ اگست ۱۹۹۳ء میں راقم الحروف کے قلم سے شائع ہوئی تھی۔

”۱۸ جولائی ۱۹۹۳ء کو اذان فجر کے وقت راقم الحروف کی نانی

صاحبہ نے کم وبیش ۹۰ سال کی عمر پا کر داعی اجل کو لبیک کہا، پھر

اس کے ایک ہفتہ بعد ہی ۲۵ جولائی کو بنارس میں منجھلی پھوپھی

صاحبہ کی وفات ہو گئی۔ اور ابھی پرسوں ۴ اگست کو عارف باللہ

حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندوی مدظلہ کی اہلیہ

صاحبہ نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی۔ انا للہ و انا

الیہ راجعون۔

راقم الحروف سے جسمانی و جذباتی رشتوں کے علاوہ تینوں

خواتین کچھ ایسی قابل تقلید خصوصیات کی حامل تھیں کہ ان کا مختصر

ذکر قارئین کے لئے یقیناً فائدہ مند ہوگا۔

نانی صاحبہ مرحومہ نے آج کی اوسط عمر کے لحاظ سے طویل عمر

پائی۔ اور گزشتہ کئی برسوں سے وہ اس حال میں تھیں کہ اعزاء ان

کی جدائی کی خبر سننے کے لئے گویا تیار تھے، اس کے باوجود جس

وقت ان کا جنازہ ہمارے گھر سے نکلا، ہر چھوٹے بڑے کی زبان

پر یہ حسرت آمیز بات تھی کہ بڑی خیر و برکت والی ذات رخصت ہوئی، نانی صاحبہ مرحومہ کی زندگی کا سب سے تابناک پہلو یہ ہے کہ انہوں نے اس دنیا کی عارضی زندگی کی محرومیوں کی تلافی فکر آخرت، یاد الہی اور سجدہ ہائے بے قرار کی صورت میں کی، اور کسی محرومی کا کبھی گلہ و شکوہ نہیں کیا — وہ بھری جوانی اور صرف ۱۹ سال کی عمر میں اس طرح بیوہ ہوئیں کہ ان کی ازدواجی زندگی کی اکلوتی یادگار میری والدہ ماجدہ تھیں، جن کی عمر اس وقت صرف ۳ ماہ تھی ان کے والد صاحب چند سال اپنی اس بیوہ بیٹی کی سرپرستی کرنے کے بعد عالم فنا سے عالم بقا کی طرف کوچ کر گئے، اور پھر اس بھری دنیا میں دنیاوی رشتوں کے لحاظ سے ان کا کوئی عزیز ایسا نہ تھا کہ جوان کی فغان دل کو سن سکے، اور بہتے آنسوؤں کو پوچھ سکے۔

ان کی غیرت مند طبیعت نے دوسروں پر بوجھ بننے کے بجائے

سلانی ٹکائی اور دوسرے ذرائع آمدنی سے اپنا اور اپنی یتیم بچی کا

پیٹ بھرنا پسند کیا۔ اور جب خدا خدا کر کے ۱۴ سال کی عمر میں

ان کی بیٹی کا عقد والد ماجد مدظلہ سے ہو گیا تو جیسے ان کے سر سے

بوجھ اتر گیا، اور انہوں نے اپنی ساری توانائیوں کا رخ اپنے

مالک حقیقی کو راضی کرنے اور اپنی عاقبت سنوارنے کی طرف موڑ

دیا۔

وہ نمازوں کی پابند ہی نہیں نمازوں کی عاشق تھیں، اور نماز کے

ساتھ ان کے عشق کا یہ حال تھا کہ ان کی زندگی کی آخری رات

میں جب کہ کئی دن سے ان کا بول بند تھا، لیکن احساس باقی تھا،

جب راقم الحروف نے ان سے سوال کیا کہ آپ نے نماز پڑھ

لی؟ تو اس کے جواب میں ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اور جب راقم الحروف اور اس کی بڑی ہمشیرہ نے مل کر ان کے دونوں ہاتھ اٹھا کر نماز کی حالت کی طرح سینے پر رکھ دیئے تو ان کے ہونٹوں میں معمولی جنبش ہونے لگی، اور چہرہ پر طمانیت کے آثار صاف طور پر نظر آنے لگے۔ راقم الحروف نے اپنے بچپن ہی سے نماز اشراق، چاشت، ادائین، تہجد اور صلوٰۃ التَّسْبِيح کا ان کو اس قدر پابند پایا کہ بہت سے لوگوں کو فرض نمازوں کا بھی اس قدر اہتمام نہیں ہوتا۔ نماز مرحومہ کے لئے فریضہ کی ادائیگی سے بڑھ کر کیف و سرور کی چیز بن چکی تھی۔ اور وہ بڑے پراعتماد لہجہ میں اکثر یہ شعر گنگنایا کرتی تھیں۔

ضائع نہ جائے گی کبھی محنت نماز کی

اللہ دینے والا ہے اجرت نماز کی.....

نماز تہجد سے پہلے اور بعد کی ان کی آہ سحرگاہی نے نہ جانے کتنی مرتبہ گھر کے دیگر غفلت کوشوں کو اپنے مالک سے لو لگانے اور اپنے حال زار پر آنسو بہانے کے لئے مجبور کیا۔ راقم الحروف ان کا پہلا نواسہ اور اولادِ نرینہ کی صورت میں پہلا فرد تھا۔ اس لئے فطری طور پر اس سے ان کو بے پناہ محبت تھی، ان کے پاس دنیا کا مال و زر نہ تھا جو دے سکتیں، لیکن اپنے اس نا قدرے نواسے کو انہوں نے ایسی ”سوغات“ بخشی، جس نے اس کے لئے کامیابی کی راہیں کھول دیں، کوئی چھوٹا بڑا تعلیمی امتحان ہو یا زندگی کا اور کوئی مشکل مرحلہ، جب راقم الحروف ان سے جا کر اپنی ”مشکل“ بیان کرتا۔ تو وہ بڑے پراعتماد لہجہ میں کامیابی کی دعا دیتے ہوئے نماز شکرانہ مان لیتیں۔ اور پھر اس ”مشکلِ مہم“

پر روانگی کے وقت نماز حاجت کی نیت باندھ لیتیں۔ وہ نمازیں پڑھ پڑھ کر اسی سے مانگتیں جس کے پاس دینے کی اصل طاقت ہے، اور وہ ”داتا“ ان کی پر کیف و پر درد مانگوں کو پورا کرتا چلا جاتا۔ کیوں کہ دینے سے اس کے خزانے میں کمی نہیں واقع ہوتی۔

اس دنیا میں ہر آنے والے کو ایک نہ ایک دن جانا ہے، نانی صاحبہ بھی اپنی دنیاوی زندگی کی مدت پوری کر کے اپنے مالک حقیقی کے پاس پہنچ گئیں، اور ہمیں امید ہی نہیں یقین ہے کہ وہ رحیم و کریم آقا اپنے گھر میں ان کے ساتھ اپنے شایانِ رحمت ہی معاملہ فرمائے گا۔ اور انشاء اللہ ان کے بے قرار جذبوں کو قرار مل چکا ہوگا۔ لیکن وہ ”سوغات“ اب ہمیں کہاں سے ملے گی۔ جو صرف نانی صاحبہ ہی سے ملا کرتی تھی۔

سدا رہے نام اللہ کا“



ایک بھولے بسرے محسن کی یاد

گھر کے بغل میں جس مسجد میں ہم لوگ نماز پڑھتے ہیں، وہ پہلے تو بہت شکستہ حال اور غیر آباد تھی۔ پھر والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے جب اپنے بچوں کے ساتھ اس مکان میں رہنے کے ارادے سے کچھ مرمت کا کام شروع کرایا جو اس مسجد کے بغل میں تھا تو پہلے شکستہ حال مسجد کو اس قابل بنایا کہ اس میں نمازیں پڑھی جاسکیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کی آبادی کا انتظام کیا۔ پھر دھیرے دھیرے آس پاس کے دو چار نمازی بھی آنے لگے، اور ماشاء اللہ مسجد میں اذان و جماعت کا نظام قائم ہو گیا۔

کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ایک بزرگ، ضعیف العمر، خمیدہ کمر، اور سفید ریش میرے والد صاحب کے پاس آئے، میرے باہری کمرہ میں بہت دیر تک والد مرحوم کے ساتھ ان کی گفتگو ہوتی رہی۔ کبھی چائے کبھی پانی وغیرہ کے لئے کئی مرتبہ میں بھی وہاں گیا۔ مجھے یہ تو اندازہ نہیں ہوسکا کہ ان دونوں حضرات کے درمیان کیا گفتگو ہو رہی ہے لیکن آتے جاتے میں نے ان بزرگ کو بہت بے قراری کے ساتھ روتے اور والد صاحب کو ڈھارس بندھاتے دیکھا تھا تو دل پر چوٹ لگی تھی اور یہ احساس ہوا تھا کہ یہ کوئی ستم رسیدہ اور دکھی آدمی ہیں۔

یہ میرے بچپن کی عمر تھی۔ نماز فرض تو نہیں ہوئی تھی لیکن گھریلو ماحول و نگرانی، خصوصاً والدہ مرحومہ کی ”کڑی نظروں“ سے ڈر کر نماز پڑھنا ہی پڑتی

تھی۔ پھر بھی موقع بہ موقع چھوڑ پکڑ بھی ہو جایا کرتی تھی۔ دن کی اکثر نمازیں مسجد ہی میں پڑھی جاتی تھیں، مسجد میں چوں کہ کوئی مستقل و مقرر امام و مؤذن نہیں تھے، کبھی والد صاحب کبھی دوسرے نمازی آکر اذان دیتے، تو دو چار نمازی جمع ہو کر جماعت کے ساتھ نماز پڑھ لیتے تھے۔ اسی لئے اذان و جماعت کے اوقات بھی مقرر نہیں تھے۔ یہ غالباً ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء کے درمیان کی بات ہے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت ہمارے محلہ کی آبادی آج کے مقابلہ میں بہت کم تھی، اور مسجدیں ماشاء اللہ اتنی ہی تعداد میں اس وقت بھی تھیں جتنی آج ہیں؟ اکثر مسجدوں میں امام/مؤذن مقرر تھے۔ لیکن گلی کوچہ کی کچھ چھوٹی مسجدیں ایسی بھی تھیں جن میں کوئی امام یا مؤذن مقرر نہیں تھے، ان ہی میں سے ایک مسجد وہ بھی تھی جو میرے مکان سے متصل تھی۔ پھر ہوا یہ کہ وہی ”بزرگ“ جنہیں دو چار روز قبل میں نے پہلی مرتبہ اپنے گھر کے باہری کمرہ میں والد صاحب سے باتیں کرتے دیکھا تھا، مجھے اسی مسجد میں نظر آنے لگے۔ اذان بھی دینے لگے، کبھی والد صاحب نہ ہوتے تو نماز بھی وہی پڑھا دیتے۔ ایک دن دو دن، پھر تو وہ اسی مسجد میں رات و دن رہنے لگے۔ اور گویا مسجد کے امام یا مؤذن مقرر ہو گئے۔ مسجد کے اندرونی حصہ میں ایک بوسیدہ سے پلے لگی الماری تھی، اس الماری میں ان کا تالا لگ گیا، اور کئی مرتبہ یہ بھی نظر آیا کہ وہ الماری سے کپڑے کی بڑی سی پوٹلی نکالتے اور پھر اپنی ضرورت کی چیز اس میں سے نکال کر یا اس میں کوئی چیز رکھ کر پھر اسی طرح پوٹلی کو الماری میں بند کر دیتے۔ میری اس وقت کی معلومات کے مطابق بس یہی ایک پوٹلی ان کا کل اثاثہ تھی۔

وہ مسجد میں کبھی خالی نظر نہیں آتے تھے، میں جب بھی اپنے گھر سے ان کے لئے کھانے پینے کا کوئی سامان لے کر جاتا تو وہ نماز پڑھتے یا قرآن مجید کی تلاوت کرتے نظر آتے۔ وہ کافی ضعیف تھے۔ ایک اندازہ کے مطابق اس وقت بھی ان کی عمر اسی برس سے کم نہ رہی ہوگی۔ کمر میں کچھ نمی آچکی تھی،

آنکھوں پر بہت موٹے شیشوں کا چشمہ اور منہ میں شاید دو تین ادھر ادھر کے بڑے بڑے دانت تھے۔ اس کے باوجود آواز کافی بلند، چہرہ بہت بارعب، اور مزاج میں کرخنگی تھی۔ شروع شروع میں تو ان کے پاس جاتے اور ان سے بات کرتے ہوئے بھی جھجک ہوتی تھی۔ پھر دھیرے دھیرے ہر وقت کے ساتھ پاس نے وہ جھجک ختم کر دی۔ میرے گھر اور گھر کے افراد سے ان کی قربتیں بڑھتی گئیں اور وہ ہمیں اپنے گھر ہی کے ایک بزرگ فرد جیسے لگنے لگے۔ اور اس رشتہ نے باقاعدگی اس وقت اختیار کر لی جب انہیں میرا ”کچا پکا“ حفظ کیا ہوا قرآن مجید باقاعدہ سننے اور یاد کرانے کا ذمہ دار بنایا گیا۔ مدرسہ کے اوقات تعلیم کے بعد میں ان کے پاس مسجد میں جاتا اور وہ میرے ساتھ جٹ جاتے۔ چوں کہ وہ حافظ نہیں تھے اس لئے اپنے سامنے بھی قرآن مجید کا دوسرا نسخہ رکھتے۔ پہلے ناظرہ کئی کئی مرتبہ پڑھواتے، پھر میں اپنے سامنے کا قرآن مجید بند کر کے سنا تا اور وہ اپنے سامنے کے نسخہ میں سنتے۔ ناظرہ بہت عمدہ اور رواں تھا، میری کوئی غلطی چھوٹ نہیں سکتی تھی۔ کبھی کبھی ایک پارہ یا اس سے بھی کم کئی کئی قسطوں میں سنتے۔ میں تھک جاتا مگر وہ نہیں تھکتے تھے۔ یہ بھی ہوتا کہ کبھی بہت دیر ہو جانے پر کچھ دیر کے لئے کھیلنے کودنے کی چھٹی دے کر تاکید کے ساتھ وقت بتا کر دوبارہ واپسی کے لئے کہتے۔ پھر کبھی تو میں دوبارہ پہنچ جاتا اور کبھی غائب رہتا تو وہ انتظار کر کے میرے گھر کے زینے چڑھ کر داخلی دروازہ کے باہر کھڑے والدہ صاحبہ کو آواز دے کر کہتے ”ارے بہو، دیکھو وہ عبدالعلی ابھی تک واپس نہیں آیا ہے اس کو بھیجو میں اسے لے کر جاؤں گا۔ اگر کبھی میں آنا کافی کرتا اور وہ سن لیتے تو وہیں سے کہتے تم لوگ ذرا پردہ میں چلی جاؤ، میں اسے پکڑ کر لے جاؤں گا۔ مجھے یاد ہے کہ میں ان سے ”پیچھا چھڑانے“ کے ہر جتن کرتا، گھر میں آکر ان کی جھوٹی جھوٹی شکایتیں کر کے گھروالوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کرتا، کبھی انہیں اس طرح

دوڑاتا کہ میں آگے بھاگتا اور وہ مجھے پکڑنے کے لئے پیچھے پیچھے دوڑتے۔ انہوں نے نہ کبھی مجھے مارا، نہ ہی میرے پیچھے اپنے کو اس طرح بڑھا پے اور ضعف کے عالم میں ہلکان کرنے کا کوئی معاوضہ لیا۔ لیکن میرا قرآن ضرور یاد کرادیا۔ اللہ ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ (آمین)

(مولوی) رحمت اللہ نام کے ان بزرگ کے بارے میں جستہ جستہ کچھ والد صاحب سے کچھ خود ان کی زبانی جو کچھ علم ہوا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ کوئی مولوی نہیں بلکہ اس دور کے اچھے خاصے ”مسٹر“ کہلانے کے حق دار شخص تھے۔ کیوں کہ وہ اس دور کا ”ہائی اسکول“ پاس تھے جس کا مقابلہ آج کا ایم۔ اے نہیں کر سکتا؟۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم نے جب انہیں سفید داڑھی، سر پر دوپلی ٹوپی، اور لمبے کرتے کے ساتھ دیکھا تو ان پر ”مولوی“ سے زیادہ چسپاں ہونے والا کوئی بھی دوسرا لفظ نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر یوں بھی ”ہمارے عرف“ کے مطابق، جس کی تعلیمی صلاحیت کے بارے میں کوئی معلومات نہ ہوں کہ وہ پڑھا لکھا بھی ہے یا جاہل ہی ہے؟ اور اگر کچھ پڑھا ہے تو کہاں تک؟ اس کے ڈاکٹر، حکیم، وکیل، انجینئر وغیرہ جیسی کسی ڈگری کے حامل ہونے کا بھی علم نہ ہو۔ اور اتفاق سے اس کے سر پر ٹوپی اور چہرہ پر داڑھی ہو تو آسانی کے ساتھ ”مولوی یا مولانا“ کہہ دیا جاتا ہے؟

بہر حال ”مولوی“ رحمت اللہ نام کے ان بزرگ نے رہتے سہتے جب ذرا ”پر پرزے نکالے“ تو علم ہوا کہ ان کی انگریزی زبان پر مہارت کی حد تک گرفت ہے۔ وہ جب کبھی پڑھتے تو انگریزی اخبار ہی پڑھتے۔ گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کے طالب علموں سے ملاقات ہو جاتی تو فوراً انگریزی میں گفتگو شروع کر کے کچھ ہی دیر میں انہیں ”راہ فراز“ اختیار کرنے پر مجبور کر دیتے۔ وہ نہ صرف زبان کو بولنے اور پڑھنے کی پوری قدرت رکھتے تھے بلکہ

انگریزی زبان کے قواعد (گرامر) پر بھی ان کی مضبوط پکڑ تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد مجھ سے بڑی بہن کو جو اس وقت اسکول کی درجہ ۴ یا ۵ کی طالبہ تھیں، پڑھانے کے لئے میرے گھر آنے لگے۔ اور اپنے شوق سے میں بھی بہن کے ساتھ ساتھ ان سے انگریزی پڑھنے لگا۔ چوں کہ انگریزی میں صرف اپنے شوق و طلب کی وجہ سے ان سے اور ”صرف ان ہی سے“ پڑھتا تھا، اس لئے بہت جی لگا کر پڑھتا تھا۔ مولوی رحمت اللہ صاحب نے میرا ذوق و شوق دیکھ کر بہن سے زیادہ مجھ پر توجہ شروع کر دی۔ اس زمانہ کے معیاری اسکولوں میں پڑھائی جانے والی کتاب Today and Tomorrow Reader کے چاروں حصہ انہوں نے مجھے پڑھائے۔ انگریزی لکھنے کی مشق اس وقت اس کے لئے استعمال ہونے والی G-Nib سے کرائی، اور مجھے اس لائق کر دیا کہ میں نے ہائی اسکول (Only English) کا امتحان دے کر کامیابی حاصل کر لی۔

دھیرے دھیرے عمر بڑھنے کے ساتھ میرے شعور نے بھی ترقی کی، اور میں نے ”شعوری آنکھوں“ سے دیکھا تو موصوف کو اپنا اور اپنے گھر کے تمام افراد کا انتہائی مخلص پایا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ ان کے دو بیٹوں میں سے بڑے بہت کامیاب تاجر اور صاحب ثروت ہیں، جب کہ چھوٹے بہت ہی غریب اور لاوڈ ہیں۔ بڑے بیٹے نے مال و دولت کے نشہ میں باپ کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کرتے ہوئے انہیں مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا تھا، جب کہ چھوٹے بیٹے کی تنگ دستی کی وجہ سے وہ ان پر بوجھ نہیں بننا چاہتے تھے۔ چوں کہ میرے والد ماجد سے ان کے مراسم دیرینہ تھے، اس لئے ”پریشانی و بے سرو سامانی کے اس عالم“ میں وہ والد صاحب سے ملے اور والد صاحب نے اپنا دست تعاون بڑھا کر انہیں جینے کا حوصلہ دیا تھا۔ اس لئے وہ والد صاحب کو بیٹے جیسا اور ان کی اولاد کو پوتوں پوتیوں جیسا پیار دے کر ہل جزاء الاحسان الا الاحسان کے قرآنی حکم پر عمل پیرا ہو گئے تھے۔ وہ مزاج کے اکھڑ، صاف

گو، اور زبان کے تیز ضرور تھے۔ لیکن ان کا دل بہت صاف و شفاف تھا۔ بیٹے کے مظالم نے انہیں بری طرح توڑ کر رکھ دیا تھا، جب کبھی اس بیٹے کا نام لیتے تو ”ظالم“ کہہ کر لیتے، اور ان کے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔ میری والدہ اور سب سے بڑی بہن سے ان کا پردہ تو تھا مگر وہ دن بھر میں دو چار مرتبہ پردہ کے پیچھے سے بات کرنے کے لئے ضرور آتے۔ میری والدہ کو وہ عموماً ”بہو“ کہہ کر ہی مخاطب کرتے تھے۔ کبھی کبھی ”جن بہو“ بھی کہہ دیا کرتے تھے۔ والد صاحب سے تو ان کے علم و مقام کا لحاظ کرتے ہوئے ذرا فاصلہ سے اور بہت ضروری گفتگو ہی کرتے، لیکن والدہ صاحبہ اور ان کی اولاد، یا پھر کبھی نانی صاحبہ سے ”اپنا دکھڑا“ بیان کر کے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے تھے۔ وہ بہت ہی خوددار، با وضع، تعلیم یافتہ، اور مہذب انسان تھے۔ میرے گھر کو انہوں نے اپنا گھر ضرور بنا لیا تھا، مگر ایک ”چھین“ تھی جو انہیں بے قرار رکھتی تھی۔ اور اپنے برتاؤ اور حسن سلوک کے ذریعہ ”والد صاحب کے احسان“ کا بدلہ کچھ بڑھا چڑھا کر ہی ادا کرنے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔

آخر عمر میں جب وہ کافی بیمار اور ضعیف ہو چکے تھے، ان کے چھوٹے بیٹے بہت اصرار کر کے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ جہاں چند ہفتے ہی وہ قیام کر سکے اور پھر اس فانی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ مجھے یاد ہے کہ جب ان کے یہ بیٹے انہیں لینے کے لئے آئے تھے تو کئی مرتبہ کی طرح پہلے انہوں نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر ان کے رونے دھونے اور بہت اصرار پر یہ شرط رکھی تھی کہ ”ہمارے گھر والے، خصوصاً والد صاحب خوشی خوشی اجازت دیں گے تب ہی جانا ہوگا“۔ اور پھر جب وہ ہمارے گھر والوں کی ”اجازت“ سے ہم سے جدا ہو کر اپنے بیٹے کے ساتھ جا رہے تھے تو ان کی کیفیت ”زندہ لاش“ کی سی تھی؟ وہ خود بھی زار و قطار رو رہے تھے اور ہم سب (جس میں خود والد صاحب اور گھر کی خواتین

بھی شامل تھیں) بھی انہیں رو رو کر اس طرح رخصت کر رہے تھے جیسے گھر سے کوئی جنازہ جاتا ہے۔ اور یہ سب کچھ غالباً اس لئے تھا کہ سب کو کچھ یقین سا تھا کہ اب اس زندگی میں یہ ان سے آخری ملاقات ہے۔ اور ہوا بھی یہی۔ فرحمة اللہ علیہ رحمة واسعة۔

مولوی رحمت اللہ مرحوم سے ہمارا کوئی خونی رشتہ نہیں تھا، انہیں میں نے اپنے گھر آتے اور گھر کا ایک رکن بننے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ لیکن یہ ان کی شخصیت کا کمال تھا کہ انہیں آسانی کے ساتھ گھر کے تمام افراد نے بڑا تسلیم کر لیا اور انہوں نے اس بڑائی کو نباہ دیا۔

بچپن کی جس عمر میں ان کا ساتھ رہا وہ کچھ بہت زیادہ سوجھ بوجھ کی نہ تھی۔ اس لئے اس وقت تو بہت کم، لیکن جوں جوں عقل و شعور میں اضافہ ہوا، مرحوم رحمت اللہ صاحب کی قدر بڑھتی گئی۔ یقیناً انہوں نے میرا قرآن مجید یاد کرانے میں بھی بڑی جاں فشانی کی۔ مجھے بہلا پھسلا کر بھی، ڈانٹ ڈپٹ کر بھی، دوڑا دوڑا کر بھی، اور شکوہ شکایت کر کے بھی، پڑھنے اور یاد کرنے پر اس طرح مجبور کیا کہ ان کی محنت اور اللہ تعالیٰ کے کرم سے میں واقعی حافظ قرآن ہو ہی گیا۔ لیکن انگریزی زبان میں جو کچھ مجھے ”شد بد“ حاصل ہوئی اسے صرف اور صرف مولوی صاحب مرحوم کے احسان سے تعبیر کرنا لازم ہے۔ میں نے انگریزی باقاعدہ کسی اسکول میں تو نہیں پڑھی، لیکن مولوی صاحب کے بعد متعدد دیگر اساتذہ سے پڑھی اور ان سے اکتساب فیض کیا جن میں ایک نمایاں نام شیخ مشیر حسین صاحب مرحوم مالک وکٹر آئس فیکٹری ویونا ٹیڈ موٹر کمپنی لکھنؤ کا بھی ہے۔ اپنی نرالی شان واداکے ”درولیش رئیس“ بھی کیا خوب تھے؟ (ان کا مختصر تذکرہ میں نے اپنی کتاب ”یادوں کے جھروکوں سے“ میں کیا ہے) انہوں نے خصوصی طور پر انگریزی اخبارات سامنے رکھ کر انہیں پڑھنے، اور خبروں کا

خلاصہ سمجھنے کا کچھ سلیقہ میری بساط کے مطابق سکھایا۔ اسی طرح دیگر دو استاذوں نے بھی اپنا اپنا تعاون عطا کر کے مجھے کسی قابل بنانے کی کوشش کی۔ حق تعالیٰ ان سب ہی کو اپنی طرف سے بہترین جزا عطا کرے۔ (آمین)۔
تاہم اسے کیوں کر فراموش کر سکتا ہوں کہ اس زبان کو سیکھنے اور اس کی طرف اپنی توجہ مبذول کرنے کا ”چسکہ“ تو مولوی رحمت اللہ مرحوم ہی نے ڈالا تھا؟، پھر اپنی خداداد صلاحیتوں اور تعلیم و تربیت کے مخلصانہ انداز کے ذریعہ انگریزی زبان و ادب کو سیکھنے، اور اسے پڑھنے لکھنے کی جو ٹھوس اور مضبوط داغ بیل انہوں نے ڈال دی تھی، اس سے حسب ضرورت و لیاقت ہمیشہ نفع حاصل ہوتا رہا۔ ان کے احسانات کا بدلہ تو کیا ہو؟ البتہ انہیں ”خراج عقیدت“ پیش کرتے ہوئے اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ

کون آیا راستے آئینہ خانے ہو گئے
رات روشن ہو گئی، دن بھی سہانے ہو گئے



میرے حافظ جی

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو سب کے لئے ”قابل ذکر“ نہیں ہوتے۔ کیوں کہ دنیا میں ”قابل ذکر“ قرار دیئے جانے کی ظاہری علامتوں میں سے کوئی علامت ان کے پاس نہیں ہوتی؟ اس کے باوجود ”کسی“ کے لئے وہ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا ذکر کرنے ہی نہیں بلکہ ”کرتے رہنے“ میں ایک خاص قسم کی لذت اور فرحت ملتی ہے۔ میرے حفظ کے استاذ حافظ سید علی صاحب مرحوم کی حیثیت میرے لئے ایسی ہی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ کئی ایسے مواقع آئے کہ حافظ جی کے سلسلہ میں کچھ لکھنے اور ان کی ”خصوصی اداؤں“ کو بیان کرنے کا تقاضا ہوا، مگر ہر مرتبہ یہ سوچ کر نہ لکھنے ہی کا فیصلہ کیا کہ لکھا جاتا ہے اس لئے کہ اسے پڑھا جائے۔ اور پڑھنے والا اسی تحریر پر اپنا وقت خرچ کرتا ہے جس میں اس کے لئے اپنی دلچسپی کا کوئی سامان ہو؟ ان دنوں رمضان کا مبارک مہینہ چل رہا ہے، اور ”لاک ڈاؤن“ نے ایسی وافر فرصت دے رکھی ہے کہ اس کا استعمال بھی بجائے خود ”ذوق کی آزمائش“ ہے؟ حالات کچھ ایسے ہیں کہ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ قید و بند کے ”اس جبر“ سے کب نجات ملے گی؟ اور اس سے بڑا سوال یہ ہے کہ اگر اس حیات مستعار میں اس جبر سے کبھی نجات مل بھی گئی تو ذہن و فکر کی صلاحیتیں اور کاغذ و قلم سے رشتہ کی یہ خداداد نعمت بھی باقی

رہ سکے گی یا نہیں؟ ایسے میں شدید تقاضا ہوا کہ ”اپنے حافظ جی“ کے بارے میں کچھ لکھ کر اپنے جی کا بوجھ ہلکا کرتے ہوئے اپنے قارئین سے دست بستہ یہ گزارش کر لی جائے کہ۔

سن لیجئے فرصت ہے، پھر کیا ہو خدا جانے
کب سے ہیں مرے دل میں بے تاب کچھ افسانے

تو بات کا آغاز یہاں سے کہ میری عمر اس وقت کم و بیش ۶۷ برس رہی ہوگی، میری پہلی درسگاہ مدرسہ تجوید الفرقان لکھنؤ میں حافظ سید علی صاحب اس وقت درجہ ناظرہ کے استاذ تھے، لیکن حفظ کرنے والے کئی بچوں کو وہ ٹیوشن کے طور پر پڑھاتے بھی تھے، اور ان کی اس سلسلہ میں بڑی شہرت تھی کہ ان سے پڑھنے والے بچے بڑے ہونہار ہوتے ہیں۔ کچھ اپنے رعب و دبدبہ سے، کچھ پیار و محبت سے، اور سب سے بڑھ کر خداداد صلاحیت سے وہ حفظ کے ابتدائی بچوں میں ایسا ذوق پیدا کر دیتے ہیں کہ بچہ بس پڑھنے ہی لگتا ہے۔ ایک دن میرے والد ماجد حضرت مولانا عبدالحلیم فاروقی مجھے لے کر حافظ جی کے پاس مدرسہ ہی میں گئے اور ان سے مجھے ٹیوشن میں پڑھانے کی درخواست کی۔ حافظ جی سے والد صاحب کے پہلے سے ”ذرا دوسری نوعیت کے“ تعلقات تھے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ میرے حافظ جی پہلے پیشہ ور موٹر ڈرائیور کی حیثیت سے شہر کے اس وقت کے ایک رئیس شیخ محمد مستنصر اللہ کے یہاں ملازمت کرتے تھے۔ شیخ صاحب مرحوم کا ہمارے خاندانی بزرگوں سے گہرا عقیدت مندانہ و باضابطہ رشتہ تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب کار کے مالک چندا نے گئے لوگ ہی ہوا کرتے تھے۔ خود گاڑی ڈرائیور کرنے کا چلن نہیں تھا، بلکہ اس کے لئے گاڑی کے مالک کو ڈرائیور کی خدمات حاصل کرنا پڑتی تھیں۔ شیخ صاحب شہر لکھنؤ کے ان چند مسلم رئیسوں میں سے تھے جو گاڑی اور

اس کے ڈرائیور کا بار اٹھا سکتے تھے۔ میرے والد صاحب کئی مرتبہ ضرورت پیش آنے پر شیخ صاحب کی اس کار پر سفر کر چکے تھے جس کے ڈرائیور ہمارے حافظ جی ہی تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پہلے حافظ جی نے اسی حوالہ سے والد صاحب سے معذرت کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں آپ کے بچہ کو نہیں پڑھا سکتا ہوں کیوں کہ میں تو آپ کا ڈرائیور رہا ہوں۔ والد صاحب نے اس کے جواب میں کیا کہا؟ اس کی تفصیل تو مجھے نہ یاد ہے نہ اسے پوری طرح سمجھنے کی وہ عمر تھی۔ تاہم والد صاحب نے کچھ ایسی بات چیت ضرور کی کہ حافظ جی نے میرے گھر آ کر مجھے پڑھانے کی منظوری دے دی۔ اور اس کے دوسرے ہی دن سے انہوں نے آنا بھی شروع کر دیا۔

گھر سے بالکل متصل مسجد میں (جس کا نام اب مسجد بلالی ہو چکا ہے) حافظ جی نے مجھے پڑھانے کا سلسلہ شروع کیا۔ وہ خود کوئی سبق نہیں دیتے تھے، بلکہ مدرسہ میں ملا ہوا سبق یاد کراتے، البتہ سبق کا پارہ اور آموختہ اپنے حساب سے اور اپنی نگرانی میں یاد کراتے اور سنتے تھے۔ دوہی چار روز کے بعد ایک ایک کر کے کچھ اور بچے بھی آنے لگے اور دھیرے دھیرے یہ ہمارا ایک مکتب بن گیا۔ اپنے مدرسہ کے ساتھی ظفر الحق تو حفظ ہی کے لئے آتے تھے، باقی ناظرہ کے لئے آنے والوں میں محمد زاہد، محمد سبحان اور محمد سلطان کے نام یاد ہیں بلکہ اب سب ہی سے کسی نہ کسی درجہ کے مراسم بھی قائم رہے۔

مدرسہ میں چھٹی کے بعد حافظ جی ظفر کے گھر پڑھانے جاتے تھے، جہاں ان کی دو چھوٹی بہنیں بھی ناظرہ پڑھتی تھیں، پھر میرے یہاں آتے اور ظفر کے لئے حکم ہوتا کہ کھانا کھا کر میرے یہاں مسجد آ جائیں۔ اس طرح ہم دونوں حفظ کے ساتھی مسجد میں بھی پڑھتے تھے۔ آخر میں جب ہمارے حفظ کی تکمیل ہونے والی تھی تو حافظ جی ہم لوگوں کو ٹیوشن کے بعد اپنے گھر بھی لے

جانے لگے تھے۔ حافظ جی لا ولد تھے۔ وہ ہم شاگردوں ہی کو اولاد جیسا پیار کرتے تھے۔ پڑھائی کے سلسلہ میں تو ان کے یہاں ”رعایت“ کا کوئی خانہ نہیں تھا، اور بوقت ضرورت اس کے لئے وہ ہماری ”مناسب سے بڑھ کر“ بھی ”خاطر مدارات“ کیا کرتے تھے۔ ان کی ”چٹکیوں اور ضربات“ کی یادگاریں میری جانگھ اور جسم کے دوسرے حصوں پر عرصہ دراز تک باقی رہیں۔ لیکن پڑھائی کے بعد چھٹی کے وقت خصوصاً بعد نماز مغرب بڑے چاؤ چوچلوں سے ہم لوگوں کو خوب خوب کھلاتے پلاتے اور اپنا پیار دیتے کہ ہم لوگ ان کی ”دوسری والی خاطر مدارات“ بھول جاتے۔ وہ استانی جی سے ہمارے لئے چائے، دہی بڑے، کباب اور نہ جانے کیا کیا پکوان بنواتے۔ اور بڑے اعتماد کے ساتھ ان سے یہ کہتے کہ یہ ہمارے بچے ہیں، ان کو کبھی دو بھر نہ کرنا۔ میرے مرنے کے بعد یہی بچے تمہارے کام آئیں گے۔ تم انہیں اولاد والا پیار دو گی تو یہ بھی تمہارے ساتھ ماں والا سلوک کرنے پر مجبور ہوں گے۔

حافظ جی کے انتقال کے بعد ہماری استانی جی کافی عرصہ تک زندہ رہیں۔ میرا ان کے گھر آنا جانا بھی رہا۔ وہ مجھ سے بہ ظاہر خوش بھی رہیں۔ لیکن مجھے افسوس کے ساتھ اس کا اعتراف ہے کہ حافظ جی کے احسانات کا میں حق نہیں ادا کر سکا۔ ان کے احسانات کا پورا صلہ تو ان شاء اللہ انہیں اپنے اس رحیم و کریم پروردگار ہی سے ملے گا جس کی رضا و خوشنودی کے لئے انہوں نے تا عمر قرآن مجید اور اس کے طالب علموں کی بے لوث خدمت کی۔ میری سرخ روئی کے لئے تو یہی کافی ہوگا کہ میری استانی جی یہ کہہ دیں کہ اس سے مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔ حافظ جی مسرت کے ساتھ میرا ہاتھ تھام کر شاباشی دے دیں۔ اور رب العالمین انہیں شاداں و فرحاں دیکھ کر میرے ساتھ اپنے خصوصی کرم کا معاملہ کر دیں۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

مدرسہ تجوید الفرقان میں میرے درجہ کے استاذ پہلے قاری محمد مظفر صاحب، پھر ان کی وفات کے بعد قاری محمد حیدر صاحب رہے، اور ان ہی کے درجہ سے میری حفظ قرآن کی دستار بندی بھی اس وقت ہوئی جب میری عمر پورے دس برس کی بھی نہیں تھی۔ حافظ جی اس وقت اور اس کے بعد بھی کافی عرصہ تک مدرسہ میں درجہ ناظرہ ہی کے استاذ رہے، پھر وہ اسی مدرسہ میں حفظ کے استاذ بھی ہو گئے۔ جہاں ان سے میرے چھوٹے بھائی عبدالولی اور میرے عزیز بھانجہ عبدالمنان مرحوم نے حفظ کی تعلیم حاصل کی۔

حافظ جی مدرسہ میں جب درجہ حفظ کے استاذ مقرر ہوئے، اس وقت ان کی عمر بھی یقینی طور پر ساٹھ برس سے تجاوز کر چکی تھی اور علیل بھی رہنے لگے تھے۔ اس لئے وہ میرے دور والی گھن گرج باقی نہیں رہی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ شیر بوڑھا اور بیمار ہو جانے کے بعد بھی شیر ہی رہتا ہے، اور اس کا ”شاہی رعب و بدبہ“ باقی رہتا ہے؟۔

بھائی اور بھانجہ کا حال چال لینے، اور اپنے حافظ جی کی دعائیں حاصل کرنے کے لئے میرا اس وقت تک برابر آنا جانا رہا جب تک میرا قیام لکھنؤ میں رہا۔ پھر جب حصول تعلیم کے لئے بہرائچ اور دیوبند میں قیام ہوا تو حاضری بہت کم ہو گئی، البتہ جب لکھنؤ آنا ہوتا تو کم از کم ایک مرتبہ تو حافظ جی کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا۔ اس دوران ہر ملاقات میں یہ دیکھ کر بہت قلق ہوتا کہ حافظ جی کی صحت دن بہ دن گرتی جا رہی ہے۔

ایک مرتبہ دارالعلوم دیوبند سے چھٹیوں میں میری لکھنؤ واپسی ہوئی تو میں ”بڑے اہتمام کے ساتھ“ خوشی خوشی ملاقات کے لئے حافظ جی کی خدمت میں حاضر ہوا، اپنے حافظ جی کو دیکھ کر اور ان سے مل کر میری ساری خوشیاں کا فور ہو گئیں۔ مجھے اپنے حافظ جی کے کینسر جیسے موذی و مہلک مرض میں مبتلا ہو جانے

کی اطلاع تو پہلے ہی مل چکی تھی، مگر مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ مرض اس حد تک بڑھ چکا ہوگا؟۔ حافظ جی شدید تکلیف میں مبتلا تھے، ان کی حلق سے آواز کافی مشقت کے بعد بھی بہت آہستہ نکل رہی تھی۔ اس کے باوجود وہ مدرسہ کی پابندی کر رہے تھے۔ جسے ان کی ”مجبوری“ کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا؟ مجھے دیکھ کر حافظ جی کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ان کا بوجھ کچھ ہلکا کر کے انہیں خوش کرنے کے لئے دلا سہ تسلی دیتے ہوئے اپنی دارالعلوم دیوبند سے تکمیل نصاب کے بعد واپسی کی اطلاع دی تو اچانک ان کا مرجھایا ہوا چہرہ کھل اٹھا۔ انہوں نے بڑے چاؤ کے ساتھ مجھے گلے لگاتے ہوئے اپنے پاس اپنی دری پر بٹھانے کی کوشش کی تو میں نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ یہ آپ کی مسند ہے۔ میں تو اپنی جگہ ہی بیٹھوں گا۔ حافظ جی نے اس تکلیف کے عالم میں بھی میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا ”نہیں، اب تو تم عالم بن گئے ہو“ جواب میں میرے منہ سے یہ نکلا کہ ”میں کچھ بھی ہو جاؤں، لیکن میری جگہ آپ کے قدموں میں ہی رہے گی“۔ تو میرے حافظ جی اس طرح پھپھک کر رو پڑے جیسے ان کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے ہوں؟ وہ مجھے اپنے سینے سے لگا کر دیر تک خود بھی روتے رہے اور مجھے بھی رلاتے رہے۔ وہ مجھے منہ بھر دعائیں دیتے رہے، اور میں ان کی ہر دعا پر ”آمین“ کہتا رہا۔ ابھی جذبات کا یہ سیل رواں کچھ کچھ تھا ہی تھا کہ حافظ جی نے قریب ہی بیٹھے میرے بھانجہ عبدالمنان مرحوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کو اب میرے درجہ سے ہٹالو! اور جب میں نے اس کی وجہ دریافت کی تو حافظ جی نے بڑی بے کسی کے ساتھ اتنا کہا کہ ”لوگ کہتے ہیں کہ میرا قرآن یاد نہیں رہا“۔ اور پھر سامنے ڈسک پر رکھے کھلے قرآن مجید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ”دیکھ نہیں رہے ہو کہ اب میں قرآن میں دیکھ

کر سنتا ہوں، تم لوگوں کے وقت میں تو ایسا نہیں تھا؟“ میں نے سمجھ لیا کہ میرے حافظ جی مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں؟ انہوں نے اپنا درد دل اپنے ایک ادنیٰ شاگرد یعنی ”اپنے روحانی بیٹے“ کے سامنے بیان کرتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ۔

یہ آنسو بے سبب جاری نہیں ہے
مجھے رونے کی بیماری نہیں ہے

ایک ڈھاڑیں مارتے شیر کو بے بسی کے ساتھ پنچڑے میں قید ہو کر تڑپتے اور پھڑکتے دیکھ کر مرے دل پر جو گزرتا تھی گزر گئی۔ دنیا کی ناقدری، اور بد نصیبوں و کم ظرفوں کی ریشہ دوانیوں و ایذاؤں کے حوالہ سے اپنے حافظ جی کو جس طرح مجھ سے بن پڑا، میں نے دلا سہ دیتے ہوئے جب ان سے یہ کہا کہ ”آپ کا اصل معاملہ اپنے اللہ سے ہے، جس کے کلام کی خدمت میں آپ نے اپنی پوری عمر لگائی۔ اور اس کا ثمرہ مجھ جیسے آپ کے سیکڑوں شاگرد ہیں جو ان شاء اللہ آپ کے لئے ذخیرہ آخرت بنیں گے۔ دنیا کے ان حاسدوں کی آپ کو کوئی فکر نہیں کرنا چاہئے.....“ تو ایسا لگا کہ میرے حافظ جی کو جیسے قرار آ گیا۔

انہوں نے مسکراتے ہوئے بس اتنا کہا کہ ”میری زندگی ہی کتنے دن کی ہے؟“ اور میں خاموش رہ گیا۔ اور پھر کچھ ہی عرصہ گزرنے کے بعد میرے حافظ جی اس فانی دنیا سے رخصت ہو کر عالم باقی کی طرف منتقل ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

حافظ جی کی وفات کی صحیح تاریخ تو مجھے بھی یاد نہیں رہ گئی، کیوں کہ ان کی وفات پر کم و بیش نصف صدی کا عرصہ گزر گیا ہے۔ اور اتنی مدت تک کون کس کو یاد رکھتا ہے؟ پھر حافظ جی کے تو کوئی اولاد بھی نہ تھی کہ نسبی سلسلہ سے ہی ان کا نام چلتا۔ لیکن یہ قرآن ہی کا فیض ہے کہ کسی نہ کسی حوالہ سے آج بھی ان کے ہم بچے کچھ شاگروں کے درمیان ان کا ”ذکر خیر“ ہو ہی جاتا

ہے، اور ان کے لئے دعائے مغفرت کی توفیق بھی مل جاتی ہے۔ حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ انہیں کروٹ کروٹ آرام عطا فرمائے، اور ان کی دنیا کی محرومیوں کی بھرپور تلافی اپنے شایان کرم انعام و اکرام کے ساتھ فرمائے۔ (آمین) ع
جانے والا گیا داستاں رہ گئی



حکیم الاسلام کے خانوادہ فاروقی سے روابط

(۱۵/۱ تا ۱۷ نومبر ۲۰۰۶ء دیوبند میں منعقد ہونے والے حکیم الاسلام سمینار کے لئے یہ مقالہ ارتجالاً لکھا گیا جو سمینار کی تیسری نشست میں ۱۶ نومبر ۲۰۰۶ء کو پیش کیا گیا۔..... مدیر)

رب کائنات کے اس انعام کی شکر گزاری کے لئے زبان و قلم میں سکت نہیں کہ اس نے ایک ایسے خانوادہ کافر دینا کر اس عالم رنگ و بو میں بھیجا جہاں علمی و دینی شخصیات سے ربط و تعلق کے لئے خاندانی نسبت ہی کافی تھی، اور اب آباء و اجداد کی نسبت سے اس ”حلال کمائی“ کا کیوں نہ ذکر کروں کہ اس بے سواد راقم الحروف نے گھر بیٹھے ہی وقت کی ایسی ایسی اہم اور جلیل القدر شخصیات کی زیارت اور جویتیاں سیدھی کرنے کی سعادت حاصل کر لی جن کی ایک جھلک پانے کے لئے ”باتوفیق“ لوگوں کو نہ جانے کیسے کیسے پاڑ بیلنا پڑتے تھے؟ و ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء۔

ان مقتدر شخصیات میں ایک نمایاں نام حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے — جن کی زیارت، اور بار بار زیارت

”حدشعور“ میں داخل ہونے سے کتنا پہلے ہو چکی تھی؟ یہ یاد نہیں! ہاں یہ ضرور یاد ہے کہ اس وقت بھی ان کا اجلا اجلا سراپا، ان کا روشن روشن چہرہ، ان کا نرم نرم لہجہ، اور ان کی تبسم برب لب گفتگو اتنی اچھی لگتی تھی کہ بے ساختہ ان جیسا بن جانے کی ”طفلانہ تمنائیں“ چلنے لگتی تھیں — اور پھر سن شعور تک پہنچنے پر ان تمناؤں نے یہ تعبیر اختیار کر لی کہ — اگر ”اجالوں کے سفیر“ مذہب اسلام کو عالم مثال میں جسمائیت عطا کی جائے تو وہ مجسم ہو کر وہی ہوگا جسے ہم ”حکیم الاسلام“ کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

بلاشبہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب ایک بلند پایہ خطیب تھے، بے مثال منتظم تھے، متکلم اسلام تھے، عظیم المرتبت مرشد تھے، سرمایہ اسلاف کے جامع تھے، مقبول ترین استاذ تھے، دارالعلوم اور مسلک دارالعلوم کے موثر ترین ترجمان تھے، کشتی ملت کے قابل اعتماد ناخدا تھے، صاحب طرز ادیب و مصنف تھے، اور اپنے لب و لہجہ، اثر و نفوذ، اخلاق و کردار، اور حسن ظاہر و باطن کے لحاظ سے ہماری اس زمین پر حق کی ایک چلتی پھرتی، مسکراتی بولتی نشانی تھے — اور ان کی کتاب زندگی کے ان حسین عنوانوں کا اجاگر ہونا اخلاف کے لئے ضروری بھی ہے اور محسن شناسی کا تقاضا بھی — تاہم راقم الحروف نے ان سب سے ہٹ کر جو عنوان اختیار کیا ہے اس کے ذریعہ اپنی ”تہی مائیگی“ کے اعتراف کے ساتھ ہی حکیم الاسلام کی نسبتوں کی قدردانی اور انداز خردنوازی کی ایک جھلک دکھانا بھی مقصود ہے۔

امام اہل سنت حضرت مولانا محمد عبدالشکور فاروقی اور ان کے برادر خرد جامع العلوم حضرت مولانا محمد عبدالرحیم فاروقی سے حکیم الاسلام کے برادرانہ رشتے اور ربط باہمی کی تفصیلات پیش کرنے سے تو راقم الحروف عاجز ہے — ہاں حکیم الاسلام کے وہ تعزیتی خطوط پیش نظر ہیں جو ان دونوں بزرگوں کی وفات کے موقع پر ان کے ورثاء کے نام بھیجے گئے۔

دسمبر ۱۹۵۶ء میں جامع العلوم حضرت مولانا محمد عبدالرحیم صاحب فاروقی کی وفات کے موقع پر ان کے برادر اکبر امام اہل سنت حضرت مولانا محمد عبدالشکور صاحب کے نام ایک، اور صاحبزادہ گرامی حضرت مولانا محمد عبدالحکیم صاحب فاروقی کے نام یکے بعد دیگر بھیجے گئے دو خطوں میں حضرت حکیم الاسلام نے نہ صرف اپنے گہرے ربط و تعلق کے ساتھ صدمہ کا اظہار فرمایا ہے، بلکہ حضرت مولانا محمد عبدالرحیم صاحب کی جلالت علم، اور اخلاق و تواضع کا جس والہانہ و غیر رسمی انداز میں ذکر فرمایا ہے اس سے ہم خردوں کو اپنے جد امجد کے مرتبہ و مقام کو سمجھنے میں بھی بہت کچھ رہنمائی ملی۔

اسی طرح اپریل ۱۹۶۲ء میں امام اہل سنت حضرت مولانا محمد عبدالشکور صاحب فاروقی کی وفات کے موقع پر حضرت حکیم الاسلام نے اپنے تعزیتی خط میں، اور پھر وفات کے بعد ان کے قائم فرمودہ ”شہدائے اسلام“ کے سالانہ جلسوں میں پہلی تشریف آوری میں دوران تقریر حضرت امام اہل سنت کے سانحہ وفات پر اپنے جس گہرے قلق اور فکر مندی کا اظہار فرمایا، اس کا لفظ لفظ درد و محبت میں ڈوبا اور ہر قسم کے تکلف و تصنع سے پاک تھا، اور اس کی تاثیر از دل خیز و بدل ریزہ والی تھی۔

۱۹۶۲ء تک چونکہ راقم الحروف سن بلوغ کو بھی نہیں پہنچا تھا اس لئے خانوادہ فاروقی کے ان دونوں بزرگوں کے ساتھ حضرت حکیم الاسلام کے روابط کے شعوری مشاہدہ و حفظ کے لائق نہ تھا — البتہ ان کے اخلاف اور اپنے بزرگوں سے اس سلسلہ میں جو کچھ سنا اور اس خانوادہ کے سلسلہ میں حکیم الاسلام کی جن مراعات کا مشاہدہ کیا وہ بے غرض اور گہرے دینی رشتہ کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔

(۱) امام اہل سنت حضرت مولانا محمد عبدالشکور فاروقی کے قائم فرمودہ لکھنؤ کے تاریخی پندرہ روزہ جلسہ ہائے ”شہدائے اسلام“ میں ہر سال کسی

ایک روز حضرت حکیم الاسلام نے شرکت اور اپنی گہر بار تقریر کو لازمی رکھا، حتیٰ کہ آخر کے دور ضعف و نقاہت میں جب کہ اطباء کے مشورہ پر رات کے جلسوں میں شرکت موقوف فرمادی تھی۔ قدیم ربط و تعلق اور وضع داری کا پاس و لحاظ رکھتے ہوئے ناعد نہ فرما کر تشریف لائے اور باشندگان لکھنؤ کو دن کی ایک پرہجوم خصوصی نشست میں اپنے ارشادات عالیہ سے مستفید فرماتے ہوئے اصلاح عقائد کے سلسلہ میں ان تاریخی جلسوں کے خصوصی کردار، جلسوں کے بانیان اور اس وقت کے منتظمین سے اپنے خصوصی ربط و رشتہ کو تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا۔

(۲) حج بیت اللہ کے لئے خانوادہ فاروقی کے متعدد افراد، اور حکیم الاسلام ایک ہی بحری جہاز میں سفر کر رہے تھے، دوسری طرف اسی جہاز میں بریلوی مسلک کے مشہور چارج مقرر و مناظر مولوی حشمت علی بھی ہم سفر تھے اور اپنی عادت کے مطابق موقع بہ موقع جراحت پاشی کرتے جا رہے تھے۔ ان کے لئے یہ منظر ہی کیا کم روح فرسا تھا کہ حضرت امام اہل سنت، حضرت جامع العلوم، حضرت حکیم الاسلام، اور خانوادہ فاروقی کے دیگر علماء کے علاوہ متعدد علمائے حق، ایک ساتھ اسی جہاز میں سوار ہو کر زیارت حرمین کے لئے جا رہے تھے جس میں سوار ہو کر سفر کرنا آں موصوف کی بھی مجبوری تھی؟ چنانچہ بحری جہاز کے اس طویل سفر میں آتے جاتے، چلتے پھرتے وہ ہمارے علمائے حق کو دیکھ کر اپنی عادت کے مطابق کوئی نہ کوئی فقرہ کس دیتے، اور اپنے لئے نشاط روح کا سامان فراہم کر لیتے — خصوصاً حکیم الاسلام کو دیکھ کر وہ بلند آواز میں یا رسول اللہ کہہ کر اپنے خیال کے مطابق ”فریضہ حق“ ادا کرنا نہیں بھولتے تھے۔

امام اہل سنت کے فرزند اور حکیم الاسلام کے شاگرد رشید حضرت مولانا محمد عبدالسلام فاروقی نے کئی مرتبہ چھیڑ چھاڑ دیکھ کر آخر اپنے استاذ محترم سے

اصرار کے ساتھ درخواست کی کہ حضرت! یا تو آپ خود ان کی ”زبان بندی“ کا انتظام کیجئے یا پھر مجھے جواب دینے کی اجازت دیجئے؟ حکیم الاسلامؒ اس وقت تو مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ لیکن اگلے موقع پر جہاز کی بالائی منزل سے اترتے ہوئے حکیم الاسلامؒ کو دیکھ کر جب مولوی صاحب موصوف نے یا رسول اللہ کا نعرہ بلند کیا تو حکیم الاسلامؒ نے زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ برجستہ فرمایا انی لست برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہوں) اس برجستہ اور حکیمانہ جواب نے مولوی صاحب کی بولتی بند کردی اور پھر وہ پورے سفر کے دوران نظریں بچا کر گزر جانے ہی میں عافیت سمجھتے رہے۔

(۳) خانوادہ فاروقی کے ایک فرد کی حیثیت سے خود راقم الحروف بھی حضرت حکیم الاسلامؒ کی شفقتوں و عنایتوں سے خوب مالا مال ہوا۔ از ہر ہند دارالعلوم دیوبند میں زمانہ طالب علمی (۹۰-۱۳۸ھ) کے قیام کے دوران ”طیب منزل“ کی عصر بعد کی مجلس میں برابر حاضری ہوتی۔ اس کے علاوہ دارالعلوم کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے اپنی مادر علمی کے سربراہ اعلیٰ کی خدمت میں اپنی غرض لے کر بھی کبھی کبھی حاضری ہوتی۔ اور اپنے فخر و اعزاز کے لئے بس یہی کیا کم تھا کہ ہزاروں طلبہ کے درمیان حضرت حکیم الاسلامؒ مجھے بھی پہچانتے تھے۔ اور اس پہچان سے فائدہ اٹھانے کا ایک واقعہ اس وقت بھی یاد آ رہا ہے کہ اپنے ایک ساتھی کو (جو غریب اور غیر مستطیع تھے اور ایک کتاب میں نمبر کم آنے کی وجہ سے ان کی امداد موقوف ہو گئی تھی) لے کر ایک ”خاص اعتماد و زعم“ کے ساتھ دارالعلوم کے دفتر اہتمام میں حاضر ہوا، اور امداد جاری کئے جانے کے سلسلہ میں پہلے سے لکھی ہوئی درخواست حضرت والا کی خدمت میں پیش کردی۔ حضرت والا نے درخواست دیکھ کر فرمایا کہ یہ تو ایک کتاب میں فیل ہیں، ضابطہ کے مطابق ان کا کھانا جاری نہیں رہ سکتا۔

میں نے ”پہچان کے اسی نشہ“ میں عرض کر دیا، لیکن حضرت! آپ کو پچاس طلبہ کا کھانا جاری کرنے کا خصوصی اختیار بھی تو ہے؟ جواب میں حضرت والا نے مسکراتے ہوئے فرمایا، اچھا آپ لوگوں کو اس کا بھی علم ہے۔ اور پھر خانوادہ فاروقی کے اس ایک ادنیٰ طالب علم کی لاج رکھتے ہوئے درخواست پر کھانا جاری کئے جانے کا حکم تحریر فرمادیا۔ نہ خوشامد کرائی، نہ سفارش طلب کی، نہ ہی معاملہ کو التوا میں ڈالا۔ تو پھر اسے خانوادہ فاروقی سے حکیم الاسلام کے خصوصی ربط و تعلق کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے؟

(۴) ۱۹۷۲ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام و تشکیل کے سلسلہ میں منعقد ہونے والے ”بمبئی کنونشن“ کا دعوت نامہ علمائے دارالمبلغین کے نام بھی آیا۔ اس وقت کی ”خاص مصلحتوں“ کی وجہ سے اس کنونشن اور مجوزہ بورڈ میں شرکت کا دعوت نامہ علمائے شیعہ کو بھی دیا گیا تھا، علمائے دارالمبلغین کو اس کا علم ہوا تو خانوادہ فاروقی کے اس وقت کے سربراہ حضرت مولانا عبدالسلام فاروقی نے حکیم الاسلامؒ کو خط لکھ کر اس کنونشن میں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی شرکت سے معذرت کر لی۔

اس کنونشن میں شرکت کرنے والوں اور شرکت کی خواہش رکھنے والوں کی کمی نہیں تھی، نہ ہی چند علمائے دارالمبلغین کے شریک نہ ہونے سے کنونشن کی ناکامی کا کوئی اندیشہ تھا۔ تاہم یہ حکیم الاسلام کی قدر افزائی اور خانوادہ فاروقی سے خصوصی ربط کی بات ہے کہ حکیم الاسلام دیوبند سے سفر کر کے لکھنؤ تشریف لائے، اور اپنے خردوں کے سامنے ان کے موقف کی صحت کا اعتراف کرتے ہوئے ”مصلحت وقت“ کے پیش نظر کنونشن میں ان کی شرکت پر اصرار فرمایا، اور یہاں تک فرمایا کہ حضرت امام اہلسنت، ان کے رفقاء اور اخلاف نے مسلمانوں کو ایک ”فکر صالح“ عطا کی ہے۔ جس کے اعتراف میں آپ حضرات کی اس کنونشن میں شرکت کو میں ضروری سمجھتا ہوں، اور آپ حضرات کی عدم شرکت

سے اس کنونشن میں مسلمانوں کے ایک ”صالح مکتب فکر“ کی کمی محسوس کی جائے گی۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کی اس قدر افزائی، اور پاس ربط و تعلق کا یہ نتیجہ تو نکلتا ہی تھا کہ پھر خانوادہ فاروقی سے حضرت مولانا محمد عبدالسلام فاروقی صاحبؒ، حضرت مولانا محمد عبدالحکیم فاروقی صاحبؒ، اور دارالمبلغین کے استاذ حضرت مولانا قاری محمد صدیق صاحبؒ نے اس کنونشن میں شرکت کی۔

(۵) اور خانوادہ فاروقی سے حکیم الاسلام کے گہرے ربط و رشتہ کا برملا اظہار تو اس وقت ہوا جب ۱۳۸۹ھ میں حضرت حکیم الاسلامؒ لکھنؤ کے ایک رئیس کی خصوصی دعوت پر تشریف لائے اور حضرت مولانا محمد عبدالحکیم فاروقی صاحبؒ کی اس درخواست کو شرف قبول بخشا کہ قصبہ کاکوری میں ان کے قائم کئے ہوئے نوخیز مدرسہ دارالعلوم فاروقیہ تشریف لے جا کر ادارہ کی ترقی و قبولیت کے لئے دعا فرمادیں۔ بعد نماز عصر کا وقت طے ہوا اور حضرت والا نے ازراہ شفقت اپنے میزبان پر اعتماد کرتے ہوئے مولانا محمد عبدالحکیم صاحب سے فرمادیا کہ آپ کاکوری پہنچیں، میں انشاء اللہ مقررہ وقت پر پہنچ جاؤں گا۔ اور پھر جب کاکوری کے لئے روانگی کا وقت آیا تو ”کچھ یاران ستم پیشہ“ نے سواری، ڈرائیور، اور راستہ کی خرابی کے حوالوں سے حضرت والا کے خیر سے دارالعلوم فاروقیہ اور قصبہ کاکوری کو محروم کر دینے کی تدبیریں کیں۔ حضرت والا نے اس سازش کو بھانپتے ہوئے اپنے ”عمومی مزاج“ کے خلاف سخت رخ اختیار کرتے ہوئے صاف فرمادیا کہ ”یہ تو ہو سکتا ہے کہ کسی پروگرام میں شرکت کے بغیر میں یہیں سے دیوبند واپس چلا جاؤں، لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ میں یہاں رہ کر کاکوری نہ جاؤں، اور مولانا محمد عبدالحکیم صاحب کی دل شکنی کروں“ اور پھر تمام راہیں آسان ہو گئیں اور حکیم الاسلام اپنے وعدہ کے مطابق کاکوری پہنچے اور مدرسہ میں چند منٹ ٹھہرے اور دعا کرانے کے بعد واپس

تشریف لائے۔

یہ وہ چند واقعات و مشاہدات ہیں جن سے خانوادہ فاروقی سے حکیم الاسلامؒ کے اس ربط کا اظہار ہوتا ہے جس کے ذریعہ حضرت حکیم الاسلامؒ کے ذاتی جواہر، اخلاقی کمالات، دین اور اہل دین سے الفت، مرتبہ شناسی، اور خردنوازی کے نمونے بھی سامنے آ جاتے ہیں۔



خدا حافظ — امی

دو کلموں کا یہ مرکب ”خدا حافظ“ اپنی امی (والدہ صاحبہ مرحومہ) کی زبان سے تو نہ جانے کتنی مرتبہ سنا؟ ہر جدائی کے وقت — چاہے وہ کسی سفر میں جاتے وقت ہو، گھر سے مدرسہ آتے وقت ہو، یا پھر شہر ہی میں کہیں جاتے ہوئے ہو — لیکن یکم دسمبر ۲۰۱۴ء کو اپنی سفید پوش امی کو ان کے اس دنیا کے آخری سفر پر روانہ کرتے ہوئے میں نے انہیں خدا حافظ کہا، اور پھر جب انہیں قبر کی گود کے حوالہ کرتے ہوئے ”خدا حافظ — امی“ کہا تو اگر ایک طرف اپنے رب کریم کی رحمت بے پایاں پر بھروسہ تھا، تو دوسری طرف کتنی ہی مختصر مدت کے لئے سہی امی کے مقدس سایہ کے بغیر زندگی کے بقیہ شب و روز گزارنے کے تصور سے وہ بے چینی تھی جو اس تحریر کے وقت بھی اس طرح اثر انداز ہے کہ بہ قول بشیر بدر میرا یہ مضمون رع

کہیں آنسوؤں سے لکھا ہوا کہیں آنسوؤں سے مٹا ہوا

اس دنیا کی ساٹھ سے زیادہ بہاریں دیکھ لینے، اور خود ادا نانا بن جانے والا آدمی اگر اپنی ۹۰ برس سے زیادہ عمر پا کر موت سے ہم آغوش ہو جانے والی ماں کی جدائی پر اپنے غم و اندوہ کا اظہار کرے تو دنیا یہ کہنے میں حق بہ جانب ہوگی کہ آخر یہ ٹھیک یا ہوا انسان چاہتا کیا ہے؟ اتنی طویل عمر پا کر، اور اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد کی ذات کی تمام بہاریں دیکھ کر کوئی عورت اس دنیا سے رخصت ہوگئی تو کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑا؟ کیا علم اور دین سے برائے نام ہی سہی، رشتہ

رکھنے والا یہ آدمی اتنی سادہ سی حقیقت سے بھی نا آشنا ہے کہ —
یہ رنگ و بہار عالم ہے، کیوں فکر ہے تجھ کو اے ساقی
تحفل تو تری سونی نہ ہوئی، کچھ اٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے
لیکن وہ لوگ جو گھر میں کسی بڑے کے وجود کی لذت سے آشنا ہیں، اور وہ
لوگ جو ماں کے آنچل میں منہ چھپا کر ہر فکر و غم دنیا کو بھول جانے کا تجربہ رکھتے
ہیں، وہ وہی کہیں گے جو مجھ سے تعزیت کرتے ہوئے معروف دانشور برادر مر
ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی صاحب نے کہا کہ

”ماں ۸۰ برس کی ہو یا ۱۸۰ برس کی، اور اولاد چاہے
۱۰۰ برس کی ہو جائے، مگر ماں کے رہتے وہ اپنے کو گھر کا چھوٹا
ہی سمجھتی ہے“ — اور یہ اپنے کو چھوٹا قرار دے لینا، بہت
سارے مفاسد کا علاج بھی ہے، اور ڈھیر ساری فکروں سے
نجات دلا کر قوت عمل کو تیز گام کرنے کا ذریعہ بھی۔

والد ماجدؒ کی ۱۹۹۴ء میں وفات کے بعد بھی والدہ ماجدہ کے سایہ شفقت
کے باقی رہنے کی وجہ سے یقینی طور پر میں اپنے گھر کا چھوٹا ہی رہا — لیکن
۳۰ نومبر ۲۰۱۴ء کو نماز عصر کے وقت سے گھر میں میری حیثیت تبدیل ہوگئی۔
میں ایک ہی مکان میں رہنے والے اپنے چاروں بھائیوں میں باعتبار عمر بڑا
ہونے کی وجہ سے گھر کا بڑا بن گیا — ”مجبوری کی اس بڑائی“ کی حقیقت
بہت پہلے والد ماجدؒ نے یوں واضح کر دی تھی کہ

”بڑائی دو طرح کی ہوتی ہے، ایک تو یہ کہ جب تمہارے بڑے
موجود نہ رہیں گے تو تم خود بخود بڑے بن جاؤ گے، مگر ”مجبوری
کی اس بڑائی“ کو حقیقتاً بڑائی نہیں کہا جاسکتا، کیوں کہ ممکن ہے کہ
تمہارے چھوٹوں میں تم سے زیادہ باصلاحیت اور لائق احترام
لوگ موجود ہوں، لیکن سن و سال اور عمر میں بڑے ہونے کی وجہ
سے بڑے تم ہی کہلاؤ گے۔ حقیقتاً بڑائی تو یہ ہے کہ اپنے بڑوں

کے رہتے ہوئے اپنی صلاحیتوں اور کمالات کی وجہ سے تم ایسے بڑے بن جاؤ کہ تمہارے بڑے بھی خوشی اور فخر کے ساتھ تمہیں بڑا کہہ کر پیش کریں۔“

میں اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہوں کہ میں کسی بھی طرح اس ”بڑائی“ کا حامل نہیں ہو سکا جس کو میرے والد ماجدؒ نے ”حقیقی بڑائی“ سے تعبیر کیا تھا۔ اس کے باوجود ”مجبوری کی بڑائی“ کا بوجھ ڈھوتے ہوئے ہی مجھے اس دنیا سے جانا ہے۔

چوں کہ آج کی دنیائے شعر و ادب میں ”ماں“ کو موضوع سخن قرار دے کر ”الفاظ کی بازیگری“ ایک فیشن بن چکا ہے۔ اور جذبات محبت و عقیدت کے بجائے الفاظ کے حوالہ سے یوں تبصرہ کیا جانا عام ہو چکا ہے کہ فلاں شاعر یا فلاں ادیب نے ”ماں“ کے سلسلہ میں اپنی تحریر میں بڑی گفتگو اور سلیقہ کا مظاہرہ کیا ہے؟ اور فلاں شخص تو ”ماں“ کے عنوان پر لکھنے میں ماہر ہے؟۔ ایسے میں اپنی ماں کی جدائی اور اس سے پیدا ہونے والے ”خلا“ کے سلسلہ میں تفصیل کے ساتھ کچھ لکھنے کی رسم ادا کرنے کو میں اپنی ماں کی اس ”ممتا“ کی بے توقیری سمجھتا ہوں جس نے نہ جانے مجھے کتنے سنبھالے دیئے اور اپنے وجود سے میرے گھر کو اعتبار و وقار بخشا۔

میں اپنی ”امی مرحومہ“ کی عبادت و ریاضت، داد و دہش، غریب پروری، اور اقربا نوازی کا ذکر کرنا، نیز ان کے اور پروردگار کے بیچ کے اس راز کو فاش کرنا بھی مناسب نہیں سمجھتا جسے انہوں نے بڑے اہتمام کے ساتھ ”راز“ بنایا تھا، اور میرا احساس ہے کہ اس کے برملا افشاؤں اور اظہار سے ان کی روح کو تکلیف ہوگی؟

امی کی اولاد میں میرے علاوہ میرے تین بھائی اور تین بہنیں ماشاء اللہ موجود ہیں۔ سب کو اپنی ماں کی چاہت ملی، ان کے دامن کی ٹھنڈی ہوا ملی، اور ان کی مستجاب دعاؤں سے سب ہی کے گلشن حیات میں بہاریں آئیں۔ مگر میں؟ اب اسے کیوں کر بیان کروں کہ مجھے بہ ہوش و حواس، اور بہ

ثبات عقل، امی کی اس فانی دنیا میں آخری سانس تک یہی احساس رہا کہ میں ان کا بڑا بیٹا ہی نہیں، ان کی ماں اور بھرم بھی ہوں۔ یقیناً اس میں امی کے کسی ”انفرادی و امتیازی سلوک“ کا دخل رہا ہوگا؟۔ لیکن اس کی تشریح کرنے سے میں خود بھی عاجز و قاصر ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ۔

یہ حالت ہوگئی ہے ایک ساقی کے نہ ہونے سے

کہ خم کے خم بھرے رہتے ہیں اور پیمانہ خالی ہے

ابھی امی کا ساتھ چھوٹے ایک عشرہ ہی تو بنتا ہے، لیکن ان کی نسبت سے قائم ہونے والا میرا بھرم کھل چکا ہے، میرے گھر کی ”مرکزیت“ دھیرے دھیرے ختم ہو رہی ہے، اور یقینی طور پر مجھے اپنی ”امی“ کی نسبت سے ”دھرتی پر پیر نہ رکھنے والی روش“ کو تبدیل کرنا ہوگا، تب ہی میں منہ لگانے کے قابل رہ سکوں گا۔ کیوں کہ اب امی نہیں ہیں جن سے میرا اور میرے گھر کا ”بھرم“ قائم تھا؟

اس حقیقت سے کسے محال انکار کہ اس فانی دنیا میں جو بھی آیا ہے اسے ایک دن واپس بھی جانا ہے، لیکن مجھے ”پیر نابالغ“ کو اشاروں سے گھر آئے ہوئے مہمان کو سلام کرنے کی ہدایت دینے والا، میری عقل و فہم پر اعتماد نہ کرتے ہوئے اب تک بڑوں سے گفتگو کرنے کا قرینہ سکھاتے رہنے والا، اور بچوں کو ڈانٹنے ڈپٹنے پر اپنے حق کا استعمال کرتے ہوئے گھڑکنے اور جھڑکنے والا، کوئی اب اس سرائے فانی میں کہاں مل سکے گا؟ امی سے اب تو حشر ہی میں ملاقات ہو سکے گی۔ خدا کرے کہ یہ ملاقات اس حال میں ہو کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے، اور ہم دونوں سے ہمارا رب کریم خوش و راضی ہوں۔ اس وقت تک کے لئے بوجھل دل، اور اس ”احساس بڑائی“ کے ساتھ جو امی عطا کر کے رخصت ہوئی ہیں یہی کہنے پر قناعت کرنا ہے کہ

خدا حافظ امی

مولانا محمد سالم قاسمیؒ (میرے آخری استاذ)

۱۴ اپریل ۲۰۱۸ء کو یہ المناک خبر آئی کہ متکلم اسلام، استاذ الاساتذہ، خطیب العصر حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب صدر المہتمم دارالعلوم (وقف) دیوبند نے داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے عالم فانی سے عالم آخرت کی طرف رحلت فرمائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

خبر اگرچہ غیر متوقع نہ تھی اور کبرسنی کے ضعف و نقاہت کے باعث تشویشناک حالت اور روز افزوں ڈھیلی پڑتی حیات مستعار کی ڈور کی اطلاعات کئی دنوں سے مل رہی تھیں، لیکن حیات مستعار کی ڈور ٹوٹ جانے کی اطلاع نے ساری دنیا خصوصاً ایشیا میں پھیلے ہوئے حضرت والا کے ہزار ہا شاگردوں، مستفیدوں اور عقیدت مندوں کو اس لئے بہت زیادہ غمگین کر دیا کہ۔

و ما کان قیس ہلکہ ہلک واحد

ولکنہ بنیان قوم تہدما

رسی ہی نہیں، حقیقی تعزیتوں کا سلسلہ جاری ہے اور حضرت والا کی نسبتوں و خصوصیات کے حوالوں سے اہل تعلق اپنے اپنے جذبات عقیدت و محبت کا اظہار کر رہے ہیں۔ حق تعالیٰ ان جذبات عقیدت و محبت کو اپنے بندوں

(جن میں راقم ناکارہ ہی نہیں، علمائے اعلام اور عارفین و کاملین و اتقیا بھی شامل ہیں) کے اظہار عقیدت کو سفارش و التجا قرار دے کر حضرت الاستاذ کے ساتھ اپنے شایان کرم معاملہ فرماتے ہوئے اعلیٰ علیین میں مقام مرحمت فرمائے (آمین) کو ما ذالک علی اللہ بعزیز۔

ایک پامال سالفظ ہر بڑی اور اہم شخصیت کے ہماری اس فانی دنیا سے رخصت ہونے پر ”خلا“ لکھا اور بولا جاتا ہے کہ فلاں..... کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پُر ہونا مشکل ہے؟ — لیکن اپنی ذاتی نسبت اور محدود معلومات کے حوالہ سے حضرت الاستاذ کی جدائی کو ”خلا“ سے تعبیر کرتے ہوئے راقم الحروف بہ حلف کہہ سکتا ہے کہ اس کے لیے یہ لفظ رسمی نہیں بلکہ حقیقی ہے۔ کیوں کہ گھریلو و مکتبی تعلیم سے لے کر دارالعلوم دیوبند اور پھر عصری درس گاہوں تک اس کے گہر بار اساتذہ کے ”سلسلۃ الذہب“ کی آخری کڑی بھی ٹوٹ گئی اور ”نسبت اعتبار“ سے محروم ہو کر اب وہ اس دنیا کی بچی کھچی زندگی کو کٹی ہوئی پننگ کی طرح بسر کرنے پر مجبور ہو گیا — یعنی۔

اک شخص کہہ رہا تھا سردار چیخ کر

شہر مراد لٹ گیا انسان مر گیا

یہ تو کوئی قابل التفات بات نہیں کہ دارالعلوم دیوبند کے زمانہ طالب علمی (۷۰-۱۹۶۷ء) میں حضرت والا کی ذات ان کے اس ادنیٰ شاگرد کے لئے اس طرح ”آئیڈل“ بنی رہی کہ ان جیسا علمی وقار، پابندی اوقات، انداز تدریس اور طرز خطاب ہی نہیں، ان جیسی وضع قطع اور لباس و رفتار پالینے اور حاصل کر لینے کی خواہشیں و تمنائیں مچلتی رہیں — اور اس دوران چھپ چھپا کر بارہا ان کی نقل کرنے کی سعی لاحق بھی جاری رہی — اسے ”نا قابل التفات“ اس لئے قرار دیا کہ میری طرح بلکہ مجھ سے بڑھ کر نہ جانے کتنے حضرت والا کے شاگرد و منتسبین ہوں گے جن کے دلوں میں یہ تمنائیں

”جامعہ دینیات اردو دیوبند“ نامی مراسلاتی نصاب و امتحانات کا ادارہ تھا جسے حضرت مولانا ہی نے قائم کیا اور اس کا دفتر بھی ان کے رہائشی مکان ”طیب منزل“ کی بالائی منزل پر تھا۔ جامعہ اردو ہی کی طرح اس ادارہ کی طرف سے سالانہ چار امتحانات ابتدائی دینیات اردو، عالم دینیات اردو، ماہر دینیات اردو، اور فاضل دینیات اردو کے نام سے مقررہ سینٹروں پر منعقد ہوتے تھے اور کامیاب ہونے والے طلبہ کو خوبصورت اسناد دی جاتی تھیں۔

جامعہ دینیات اردو اور اس کا پورا نظم و انتظام، حضرت مولانا کی علمی فتوحات، دور بینی و دوراندیشی، ترسیل علم کی سہل الحصول راہوں کی تلاش، فکر رساء اور مہم جوئی کی ایسی مثال ہے جس کا دور دور تک تصور نہیں کیا جاسکتا ہے۔ چوں کہ حضرت والا کی عطا فرمودہ جرأتوں کے طفیل میں اپنی کم سنی کے باوجود ان سے ملاقات کرنے — بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ ان کا دیدار کرنے اور ان کی مشغولیات کا مشاہدہ کرنے کے لئے اکثر، بلکہ بسا اوقات ہفتہ میں کئی بار بعد نماز مغرب ”جامعہ دینیات اردو“ کے دفتر جاتا تھا، اس لئے کسی قدر قریبی مشاہد کی حیثیت سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ اتنے بڑے اور پورے ملک میں پھیلے ہوئے نظام کا محور حضرت مولانا ہی کی ذات تھی جس میں ان کے قریبی مشیر و معاون کی حیثیت سے مولانا عبدالرؤف عالی، مولانا محمد حسن باندوی، اور مولانا عبداللہ جاوید شامل تھے..... اور بس! (یہ میرے دور کم سنی کے غیر تجربہ کارانہ مشاہدہ کی بات ہے — ممکن ہے کہ کچھ اور لوگ بھی شامل ہوں جس کا مجھے علم نہ ہو)۔ جامعہ کے ان امتحانات اور ان کی اسناد کی کشش نے اردو اور دینی علوم دونوں کو ان حلقوں تک پہنچانے کا کارنامہ انجام دیا جہاں تک کسی دوسرے واسطہ سے رسائی نہیں ہو سکتی تھی۔

غالباً اب دارالعلوم کا شعبہ ”معارف القرآن“ اور حضرت مولانا کا ”جامعہ دینیات اردو“ اپنی فعالیت کو کھوپچے ہیں — اور یہ اسی لئے کہ کبر سنی و

دیگر عوارض کی وجہ سے یہ دونوں ادارے حضرت والا کی بیدار و موثر سرپرستی سے محروم ہو چکے تھے؟ والعلم الحقیقی عند اللہ۔

میرے دور طالب علمی کے دوسرے تعلیمی سال (۶۹-۱۹۶۸ء) میں دارالعلوم میں طلبہ کی حشر انگیز اور اس وقت تک کی تاریخ کی سب سے جارحانہ و بد لحاظی کی حامل اسٹرائک ہوئی، اور ظاہر ہے کہ یہ اسٹرائک انتظامیہ ہی کے خلاف تھی جس کے اس وقت سربراہ اعلیٰ اور مہتمم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب تھے جن کے فرزند اکبر حضرت مولانا محمد سالم صاحب ان کے مشیر خاص اور دارالعلوم کے باوقار استاذ تھے۔ اسٹرائک کے لیڈروں نے پوری طرح دارالعلوم کی عمارات پر قبضہ کر کے ”حکم“ جاری کر دیا تھا کہ مطبخ و صفائی کے عملہ کے سوا انتظامیہ و اساتذہ کے عملہ میں سے نہ کسی کو دارالعلوم کے اندر آنے کی اجازت ہوگی نہ ہی کسی طالب علم کو اساتذہ کے گھر جا کر ملنے و ملاقات کرنے کی اجازت ہوگی۔ پولیس (اور جلا د) کی شکل کا طلبہ کا ایک دستہ بنا دیا گیا تھا جو عام طلبہ کی ہر نقل و حرکت پر نظر رکھتا تھا، اور ادنیٰ سا شک ہو جانے پر زد و کوب اور قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار کرتا۔ عام طالب علم نہ دارالعلوم کی چہاردیواری کے باہر نکل کر کسی سے داد فریاد کر سکتا تھا نہ ہی ”اسٹرائیکی لیڈروں“ کے کسی حکم سے سرتابی کر سکتا تھا۔ صبح سے دیر رات تک وقفہ وقفہ سے جلسے ہوتے رہتے جس میں اشتعال انگیز تقریروں و نظموں کے ذریعہ اپنے مطالبات پیش کرتے ہوئے طلبہ کی ذہن سازی کی جاتی، اس دوران ”پولیس دستہ والے“ طلبہ کے کمروں میں گھوم گھوم کر جاتے اور جلسہ میں شریک ہونے کا حکم جاری کرتے رہتے — اسی سلسلہ کا ایک ”انتظام“ یہ بھی تھا کہ اسٹیج پر آ کر تقریر کرنے اور اسٹرائک کی حمایت و تائید میں نظماً و نثر بیان دینے کے لئے ہر ضلع کے طلبہ کی نمائندگی لازمی قرار دی گئی۔ اگر کسی ضلع کی نمائندگی نہ ہوتی یا کم ہوتی تو ”پولیس دستہ“ کے لوگ اپنے انداز میں نمائندگی درج کراتے؟۔

خلاصہ یہ کہ ایک عجیب خوف و ہراس کا عالم تھا، اور اس ”جارحانہ اسٹرائک“ میں دل سے آمادہ نہ ہونے والے طلبہ بھی اختلاف کی جرأت نہیں کر سکتے تھے..... ورنہ انہیں ”عتاب“ سے کون بچاتا؟۔

اس وقت لکھنؤ ضلع سے صرف میں اور اسی تعلیمی سال میں مظاہر علوم سہارن پور سے آکر دارالعلوم میں داخلہ لینے والے میرے عم زاد مولانا عبدالعلیم فاروقی — یعنی ہم دو بھائی ہی تھے، جو حضرت مہتمم صاحب و دیگر اساتذہ دارالعلوم سے اپنے دیرینہ خاندانی رشتوں کی وجہ سے کسی طرح اس اسٹرائک کا حصہ نہیں بننا چاہتے تھے۔ تاہم کب تک؟ — آخر ایک دن یہ پتہ چلا کہ آج رات میں کسی وقت ہمارے کمرہ پر ”چھاپہ“ پڑے گا؟ چوں کہ ہمارا اس وقت کے ”دارالشفاء“ کا کمرہ احاطہ دارالعلوم سے کچھ ہٹ کر تھا، اور پھر ہمارے اعلیٰ بغل شیخ الحدیث حضرت مولانا فخر الدین صاحب کی قیام گاہ اور شیخ الاسلام حضرت مدنی کی اہلیہ صاحبہ کا مکان بھی تھا۔ اس لئے ہم لوگ نسبتاً ”کھلے“ میں تھے — اور اسی کا فائدہ اٹھا کر ہم دونوں بھائی ہمت کر کے چھپتے چھپاتے قریب ہی میں واقع حضرت مولانا محمد سالم صاحب کی قیام گاہ میں بعد نماز مغرب پہنچ گئے۔ حضرت مولانا نے ہمیں اس طرح ہوا سے باختہ دیکھ کر بڑی شفقت کے ساتھ دریافت فرمایا کہ کیسے آگئے؟ اور کیوں آئے؟ ہم نے اپنی داستان سناتے ہوئے منہ بسورتے اور آنسو بہاتے کہا کہ حضرت اسٹرائکی لیڈروں کے بارے میں پتہ چلا ہے کہ آج وہ دھاوا بولیں گے — اب ہم کیا کریں؟ اور ان کے عتاب سے کیسے بچیں؟ ہماری ”داستان درد“ سن کر حضرت نے جو فرمایا وہ ان کی عالی ظرفی، خرد نوازی، نسبتوں کے لحاظ، اور ایثار و اعتماد کی سنہری تاریخ کا ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے کہ حضرت نے خود اپنے، اپنے والد ماجد اور چہیتوں کے خلاف بولنے کی نہ صرف اجازت بلکہ ترغیب دیتے ہوئے فرمایا ہمیں آپ کی سعادت مندی اور تعلق پر اعتماد ہے۔

آپ ہم لوگوں کی طرف سے فکر مند نہ ہوں۔ ہمیں اندازہ ہے کہ آپ لوگ کس جبر کا شکار ہیں — اس لئے ان کے مطالبہ کو پورا کر کے ان کے عتاب سے اپنے کو بچا لیجئے اور ضروری ہو تو ”ہمارے خلاف“ ان کے اسٹیج سے تقریر بھی کر دیجئے گا — اس سلسلہ میں حضرت مہتمم صاحب و دیگر منتظمین سے ہم بات کر لیں گے۔

حضرت والا کے اس حیرت انگیز، لیکن اطمینان بخش جواب کو لے کر بہ عجلت تمام ہم لوگ اپنے کمرہ میں واپس آ گئے — اور پھر وہی ہوا جس کی پہلے ہی اطلاع مل چکی تھی کہ نصف شب کے بعد اسٹرائیکیوں کے سب سے محبوب قائد اور اس وقت کے سب سے جارح و بدکلام لیڈر اپنے حواریوں کے ساتھ ہمارے کمرہ میں آدھمکے، اور کسی ”رورعایت کے بغیر“ صبح کے جلسہ میں اسٹرائک کی حمایت میں پرزور تقریر کے لئے ہم دونوں بھائیوں میں سے مولانا عبدالعلیم صاحب کا نام منتخب کر کے لکھ لیا، اور پھر دوسرے دن ان کی تقریر کرنا ہی دم لیا؟ اب اسی سلسلہ میں حضرت مولانا کی کرم فرمائی اور ”اعتماد خاص“ کا ایک نمونہ اس طرح بھی سامنے آیا کہ جب جارح و اسٹرائیکی طلبہ کی شورہ پشتیاں اپنی انتہا کو پہنچ گئیں تو مجبوراً دارالعلوم کی انتظامیہ نے پولیس کی مدد طلب کی، اور دارالعلوم میں تا اطلاع ثانی تعطیل کا اعلان کرتے ہوئے دارالاقامہ (ہاسٹل) کو طلبہ سے خالی کرا کے انہیں اپنے اپنے گھروں کو روانہ کر دیا — پھر جب کم و بیش ایک ماہ کی طویل مدت کے بعد انتظامیہ کی طرف سے دی گئی اطلاع پر ہم دونوں بھائی بھی دوبارہ دارالعلوم پہنچے تو حالات پوری طرح قابو میں آچکے تھے۔ ۳۵ اسٹرائیک کے سرغنہ قرار پانے والے طلبہ کا اخراج ہو چکا تھا اور ایک فہرست ”مشتہدین“ کی بھی جاری ہو چکی تھی۔ ہم لوگ مطمئن تھے کہ ہمارا نام ان دونوں میں سے کسی فہرست میں نہیں تھا، اور ہم یک سوئی کے ساتھ اپنی تعلیم میں مشغول ہو گئے تھے کہ اچانک ایک ”افتاد“ اس طرح آئی کہ ہمیں اطلاع ملی کہ

ہمارے خصوصی کرم فرما اور خیر خواہ و دعا گو بزرگ حضرت مولانا محمد اسعد اللہ صاحب ناظم اعلیٰ مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور ہم دونوں بھائیوں سے ”دارالعلوم کی اسٹرائٹ میں سرگرم حصہ لینے کی وجہ سے“ سخت ناراض ہیں اور اپنے خدام کو تاکید کر دی ہے کہ اگر ہم ملاقات کے لئے حاضری دیں تو منع کر دیا جائے۔ یہ اطلاع ہم دونوں ہی کے لئے سخت تشویش و اضطراب کا باعث بنی، خصوصاً اس وجہ سے کہ حضرت ناظم صاحب کو ہماری اسٹرائٹ میں سرگرم شمولیت کی جو اطلاع ملی تھی وہ یقیناً ”دوستوں کی حاشیہ آرائی“ تھی۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ حضرت کو صحیح صورت حال سے آگاہ کر کے ان کی ناراضگی دور کرنے کا سامان کیوں کر کیا جائے؟ بہت غور و فکر کے بعد ایک مرتبہ پھر حضرت الاستاذ مولانا محمد سالم صاحب ہی کی خرد نوازی و کرم فرمائیوں پر اعتماد کرتے ہوئے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے چارہ گری کی درخواست کی، حضرت والا نے ایک مرتبہ پھر اپنی نوازشوں کی بارش کرتے ہوئے ہمارے درد کا فوری مداوا کرنے کا فیصلہ فرمایا، اور ہم دونوں کو بیٹھنے اور انتظار کرنے کا حکم دے کر ”طیب منزل“ ہی کے ایک کمرہ میں چلے گئے۔ کم و بیش نصف گھنٹہ کے بعد حضرت والا اپنے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا مے ہوئے اس حال میں واپس آئے کہ آپ پسینے پسینے ہو چکے تھے۔ پھر حضرت ناظم صاحب کے نام لکھے گئے اس سفارشی خط کو لفافہ میں رکھوا کر ہمارے حوالہ کرتے ہوئے بڑے اعتماد کے ساتھ فرمایا کہ یہ خط لے کر حضرت کے پاس جائیے، انشاء اللہ کام ہو جائے گا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ جب ہم لوگوں نے سہارن پور پہنچ کر حضرت ناظم صاحب کی خدمت میں وہ سفارشی خط پیش کیا تو اس کا مطالعہ کرتے ہی ان کی ساری شکایات دور ہو گئیں، انہوں نے نہ صرف ہمیں معاف کر کے اپنے قدموں میں جگہ مرحمت فرمائی بلکہ اپنی شفقت آمیز نصیحتوں، اور رقت آمیز دعاؤں سے نوازنے کا سلسلہ جاری فرمادیا۔ کاش کہ حضرت الاستاذ کا وہ سفارشی نامہ

یا اس کی نقل ہمارے پاس محفوظ ہوتی! تاکہ ہم اس ”دستاویز اعتماد“ کے سہارے سرخروئیاں حاصل کر سکتے! — حقیقت یہ ہے کہ وہ صرف ایک سفارشی خط ہی نہیں تھا بلکہ ایک عالم و دانا اور آداب شناس خرد کا اپنے صاحب نسبت و صاحب علم و عمل بزرگ کے نام لکھا ہوا ایک ایسا مؤثر و طاقتور رقعہ تھا جس نے فوری اثر سے اپنا کام تو کیا ہی۔ مزید یہ کہ حسن تحریر، حسن اداء، اور عرض مدعا کے باسلیقہ نکات سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے ہم بے سلیقہ لوگوں کے واسطے اس کی حیثیت ”دستاویزی“ بھی تھی۔ یوں تو وہ ایک وقتی ”سفارش نامہ“ تھا، اور اپنا کام بن جانے کے بعد اس کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ لیکن اس خط میں ہم پر اپنے اعتماد کا اظہار کر کے حضرت والا نے خاندانی نسبتوں اور ذاتی سعادت مند یوں کا حوالہ دیتے ہوئے یہاں تک تحریر فرمایا تھا کہ ”میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ دارالعلوم کے اس ہنگامے اور اکابر کے خلاف برپا کئے جانے والے اس تشدد سے ان بچوں کا نہ کسی قسم کا کوئی تعلق رہا نہ ہی یہ اس پر راضی رہے۔ اور جبراً و کرہاً انہیں اپنے تحفظ کے لئے جتنا شریک ہونا پڑا اس میں بھی ان بچوں سے زیادہ آپ کے اس ناکارہ خادم کا دخل تھا اور اسی کے ایما پر ان بچوں نے شورہ پشتوں کی تائید میں وہ تقریر کی جسے مبالغہ آمیز انداز میں آپ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس لئے آپ کی تکلیف کا باعث ان بچوں سے زیادہ آپ کا یہ خادم بنا ہے جو بصدد ادب اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے معافی کا طلب گار ہے اور حضرت سے یہ درخواست کرتا ہے کہ ان سعید و صالح بچوں کو اپنی شفقتوں و دعاؤں سے محروم نہ کریں“ (کم و بیش مفہوم یہی تھا، ممکن ہے کہ الفاظ میں کچھ تغیر و تبدل ہو گیا ہو)۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ تحریر خود صاحب تحریر کی کس عالی ظرفی، وسعت قلبی، اور نسبتوں کے لحاظ و آداب شناسی کی غماز ہے؟ — اسی لئے تو با حسرت و افسوس کہنا پڑ رہا ہے کہ اے کاش کہ وہ تحریر محفوظ ہوتی!

دارالعلوم کا دور طالب علمی ختم ہونے کے بعد حضرت والا سے ملاقات تو

بس گاہے ماہے ہی ہو پاتی تھی، لیکن میں انتہائی مسرت و فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ حضرت والا کی خصوصی توجہات و اعتماد سے کبھی محروم نہ رہا۔ چنانچہ ایک موقع ایسا بھی آیا کہ حضرت کے اس ”اعتماد خاص“ نے ان کے اس ناکارہ شاگرد کو ”امتحانی مرحلہ“ سے بھی گذار کر سرخ رو ہونے کی سعادت بخشی — ہوا یوں کہ جب حضرت مولانا ”آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت“ کے صدر منتخب ہوئے تو ایک دن حضرت کا فون آیا۔ چوں کہ میں اس وقت گھر میں نہیں تھا اور فون لینڈ لائن والا تھا اس لئے حضرت والا نے بتا کید اپنا نام بتا کر حکم دیا کہ وہ گھر آنے کے بعد فوراً ہم سے فون پر رابطہ کر لیں؟ چنانچہ گھر واپس آنے کے بعد اطلاع ملتے ہی میں نے فون پر رابطہ کیا تو حضرت والا نے اپنے مشاورت کا صدر منتخب کئے جانے کی اطلاع دیتے ہوئے فرمایا کہ احباب کے اصرار پر میں نے یہ عہدہ اس شرط پر قبول کر لیا ہے کہ میں اپنے اعتماد و بھروسے کے ارکان بھی خود ہی منتخب کروں گا۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں آپ کے تعاون کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے میں نے آپ کو ”مجلس مشاورت“ کا رکن بنانے کا فیصلہ لیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ آپ کے اپنے سوچے سمجھے لائحہ عمل کے خلاف اور آپ پر جبر ہے — لیکن میری ضرورت کا خیال کرتے ہوئے آپ اسے منظور کر لیجئے۔ آپ کی منظوری کے بعد اس کی باضابطہ و رسمی اطلاع آپ کو دے دی جائے گی۔

حضرت والا کا یہ حکم پا کر میں کچھ دیر اس لئے خاموش رہا کہ میں نے کچھ تو اپنی نااہلی پر نظر رکھ کر اور کچھ اپنے مزاج و طبیعت کے پیش نظر دیگر مخلوقات کی رعایت سے کسی بھی جماعت یا تنظیم میں اس کا ایک جز یا رکن بن کر شامل نہ ہونے کا فیصلہ کر رکھا تھا اور ایسے متعدد مواقع آنے اور اصرار ہونے پر بھی میں نے اپنے اس فیصلے پر قائم رہتے ہوئے رکنیت اور قابل لحاظ عہدوں کو بھی نظر انداز کیا تھا — لیکن حضرت والا کے دوبارہ استفسار پر میں نے بس اتنا

ہی کہا کہ ”جیسا حکم ہو“ حضرت والا نے بھی جزاک اللہ کہہ کر فون کا سلسلہ منقطع کر دیا — پھر کیا ہوا؟ اور کیا وجوہات پیش آئیں کہ نہ میرے پاس پھر کوئی ”باضابطہ و رسمی خط“ آیا، نہ کبھی حضرت والا نے تقاضا کیا، نہ ہی اس کا ذکر چھیڑنا میں نے مناسب سمجھا؟

اس واقعہ کو ذکر کرنے سے یہ بیان مقصود ہے کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب ملک کے اندر ہی بلا مبالغہ ہزار ہا ہزار کی تعداد میں حضرت والا کے مستفیدین و منتسبین موجود رہے ہوں گے — مگر میری خوش بختی کہ حضرت کے دل تک میری اتنی رسائی تھی کہ انہوں نے میرا انتخاب کرتے ہوئے مجھ پر اپنے اعتماد کا اظہار فرمایا۔

آخر میں اپنی خود ستائی نہیں، بلکہ حضرت الاستاذ کی خرد نوازی، وسیع القلمی، اور اپنے ایک ناقابل ذکر شاگرد پر اعتماد اور اس کی حوصلہ افزائی کی مثال کے طور پر حضرت کے اس تعزیتی مکتوب کا ایک اقتباس پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں جو میرے والد ماجد کی وفات پر حضرت والا نے بہ طور خاص بھیجا تھا۔

”عمومی طور پر ملت نواز خدام دین، اہم شخصیات کے اٹھ جانے پر ارباب تعلق و محبت کی نگاہیں، ان کے خاندانوں میں ان کا بدل نہ پا کر بددل ہوا کرتی ہیں۔ مگر الحمد للہ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مقبولیت عند اللہ کی منجملہ علامات میں خود آں عزیز کی موثر شخصیت ہے جسے حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے آباء و اجداد گرامی کی علمی و اخلاقی روایات کا مکمل نمونہ بنا کر اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا مرحوم کو عطا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ عمر و اقبال کی برکات کے ساتھ اس فیضانِ عالم گرامی کو آپ کے ذریعہ عموم و شمول عطا فرمائے۔ (آمین)“

حضرت الاستاذ کے امتیازی اوصاف حمیدہ کا ذکر مکمل نہ ہوگا، اگر دارالعلوم

کے اجلاس صد سالہ کے بعد پیدا ہونے والے کرب ناک حالات اور پھر دارالعلوم کے دلچخت ہونے کے حوالہ سے حضرت والا کی علوہمت، استقلال، اور پامردی کے ساتھ مخالف حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے ”وقف دارالعلوم“ کی شکل میں شر سے ایک خیر برآمد کر لینے کا سرسری طور پر ہی سہی، ذکر نہ کیا جائے؟ اس حوالہ سے انتہائی اہم اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس پورے ”شاخسانہ“ کا محور و مرکز حضرت والا ہی کی ذات تھی، اس لئے ان پر جو کچھ گذرنا تھا وہ گذر کر رہا، لیکن کمال ظرف و ہمت کی بات یہ ہے کہ انہوں نے ان پر آشوب اور حوصلہ شکن حالات میں اپنے اہل تعلق سے نہ کسی حمایت کا مطالبہ کیا، نہ ہی ان پر کسی قسم کا غیر ضروری دباؤ بنا کر انہیں کسی ”آزمائش“ سے دوچار کیا؟

اس پوری ”ہنگامی مدت“ میں خود راقم الحروف کا یہ فیصلہ بہ تائید حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ رہا کہ اس نے اپنی زبان اور اپنے قلم کو کسی کی حمایت اور کسی دوسرے کی مخالفت سے محفوظ رکھتے ہوئے ”اپنی اوقات“ پہچان کر اپنے اکابر کے خلاف زبان طعن دراز کرنے کے بجائے خاموش رہ کر دعائے خیر کرتے رہنے ہی میں عافیت سمجھی۔ اگرچہ راقم الحروف کی ادارت میں شائع ہونے والا رسالہ ”البدر“ بھی دو ڈھائی برس پہلے ہی سے جاری ہو چکا تھا، اور اس کے ”حلقہ“ نیز اپنے اکابر و اصاغر اور ہم سروس کی طرف سے بار بار شدید تقاضے بھی ہوئے کہ

کچھ تو لب کھول کہ ہنگامہ اٹھے دیر ہوئی

بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ ”بعض بڑوں“ وہم سروس نے کچھ زیادہ ہی بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ”منافق اور نمک حرام“ کہنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ مگر راقم الحروف نے اپنی زبان خاموشی سے انہیں بھی بس یہی جواب دیا کہ

تیر پر تیر چلاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے
سینہ کس کا ہے مری جان، جگر کس کا ہے

بہ ہر حال ”طوفان بلا سر سے گذر جانے کے بعد“ میرے لئے باعث صد فرحت و افتخار یہ بات ثابت ہوئی کہ میں اپنی اس ”غیر منفعت بخش“ روش کے طفیل اپنے تمام اکابر سے آنکھیں چار کرنے کے لائق رہا۔ اور ظاہر ہے کہ ان میں سب سے اہم و مقدم ہمارے استاذ گرامی قدر ہی تھے، جن کی جدائی پر آج میں تو قلم کے آنسو بہا رہا ہوں لیکن ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ وہ اپنی بولتی آنکھوں اور مسکراتے لبوں سے ہم غفلوں کو یہ پیغام دے رہے ہوں کہ

سورج ہوں زندگی کی رمت چھوڑ جاؤں گا

میں ڈوب بھی گیا تو شفق چھوڑ جاؤں گا

بات ذرا لمبی ہو گئی۔ اور شاید موضوع سے کچھ ہٹ کر بھی، کیوں کہ بولنے اور لکھنے والے تو حضرت الاستاذ کے علمی کمالات، تدریسی خدمات، ساحرانہ خطابات، پاپھر تصنیف و تالیف اور ارشاد و معرفت کے حوالوں سے ان کے اس دنیائے فانی سے رخصت ہونے پر اپنے رنج و الم کا اظہار کر رہے ہیں۔ اور غالباً اسی کا موقع بھی ہے؟۔ لیکن بہت سے بولنے اور لکھنے والوں کو ابھی بہت سے مواقع میسر ہیں، اور وہ آئندہ بھی بولتے اور لکھتے رہیں گے، جب کہ اپنے آخری استاذ کی اس دنیا سے رخصتی اور استاذ کے دیدار سے محرومی کے بعد مجھ جیسے تنہا تنہا شخص کے پاس اس کے سوا کہنے اور لکھنے کے لئے کچھ نہیں کہ

پاس کوئی نہیں اور ہے بھی تو تنہائی ہے
آجا آجا کہ اکیلا ترا سودائی ہے
ہو کا عالم، سر بالیں، شب تنہائی ہے
ہائے کس وقت ”تمہیں“ لینے کو موت آئی ہے

سلام قولاً من ربکم طبتُم فادخلوہا خالدین — یا آیتہا النفس

المطمئنة ارجعی الی ربک راضیة مرضیة فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی۔

مولانا محمد واضح حسنیؒ اک مرد خدا مست تھا نہ رہا

۱۶ جنوری ۲۰۱۹ء کو نماز فجر کے بعد تلاوت قرآن مجید میں مشغول تھا کہ اسی دوران پہلے کچھ وہاٹس ایپ میسج آئے اور پھر فون کی گھنٹی بجی، اور دوسری طرف سے فون کرنے والے نے بتایا کہ ابھی کچھ دیر پہلے عین اذان فجر کے وقت حضرت مولانا محمد واضح رشید حسنی صاحب کی وفات ہوگئی۔ اول وہلہ میں اس اچانک خبر پر بے یقینی سی رہی۔ اسی لئے تلاوت مکمل کر کے آئے ہوئے میسج دیکھے تو اس خبر پر یقین کرنا ہی پڑا۔

خبر کی تصدیق کے لئے یہ مختصر چھان بین اس لئے کرنا پڑی کہ چند روز پہلے ہی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مولانا مرحوم سے ملاقات ہوئی تھی تو وہ بالکل چاق و چوبند اور میرے اپنے خیال کے مطابق پوری طرح صحت مند تھے جب کہ ان کے برادر اکبر حضرت مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ کی علالت کا سلسلہ چل رہا تھا۔ گو بہت قریبی نہ سہی، مگر مولانا واضح صاحب مرحوم سے اتنا رشتہ و تعلق تو تھا ہی کہ اگر وہ کسی سنگین بیماری میں مبتلا ہوتے تو مجھے کسی نہ کسی ذریعہ سے اطلاع مل ہی جاتی۔ اس لئے ان کی اچانک خبر وفات نے غفلت کے پردے

سرکائے تو کچھ دیر کے لئے ہی سہی، اپنی موت بھی قریب نظر آنے لگی، اور اس کی شاید ایک وجہ یہ بھی رہی ہو کہ گذشتہ تین ہفتوں سے بستر علالت پر تھا۔ بہ ہر حال دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر بستر علالت ہی سے اٹھ کر ندوۃ العلماء اس لئے پہنچ گیا کہ آخری دیدار کر سکوں، کیوں کہ یہ یقین تھا کہ تدفین آبائی قبرستان رائے بریلی میں ہی ہوگی اور اس وقت میں وہاں جانے کی حالت میں نہ تھا۔ مولانا مرحوم کا اجلا اجلا اور منور چہرہ دیکھا جس پر موت کے کچھ آثار نہ تھے، بلکہ اس کا آئینہ تھا کہ ۔

نشانِ مردِ مومن باتو گویم
چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

ساتھ والے اسی کمرہ میں جہاں دونوں بھائی ایک ساتھ رہتے تھے، بڑے بھائی حضرت مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ کی بس ایک جھلک پانے کی غرض سے حاضری دی، حضرت مولانا کی خردنوازی کہ اس عالم میں بھی مجھے پہچان کر چادر کے اندر سے ہاتھ نکال کر مصافحہ کے لئے بڑھایا اور میں مصافحہ کر کے فوراً ہی اس کمرہ سے نکل آیا۔ کیوں کہ وہ اس سے زیادہ نوازش کے حال میں نہ تھے اور میرے اندران سے کچھ کہنے یا زیادہ دیر تک انہیں اس حال میں دیکھنے کی تاب نہ تھی؟۔

حضرت مولانا واضح رشید صاحب وہاں چلے گئے جہاں جانے ہی کے لئے اس دنیائے فانی میں سب آتے ہیں۔ کوئی نئی بات نہیں، پھر وفات کے وقت ان کی عمر بھی کچھ ایسی کم نہ تھی کہ دنیا والے یہ کہہ سکیں کہ بڑی کم عمری میں دنیا چھوڑ دی۔ تاہم قریبی لوگوں اور مستفیدین کی بات نہیں، کم وبیش دو ماہ کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی مجھ جیسے غافل و ناقد رے شخص کو بھی جب خیال آ جاتا ہے کہ اب جانے والے سے اس دنیا میں کبھی ملاقات نہ ہو سکے گی تو ایک

نا قابل بیان قسم کا احساس محرومی تو ہو ہی جاتا ہے۔ جب یہ کیفیت مجھ ناکارہ کی ہے تو ان کے قدر شناسوں و قدر دانوں اور ان سے سچی محبت کرنے والوں، اور ان سب کے سرخیل، ہر دم کے رفیق و انیس حضرت مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ اور مرحوم کے اکلوتے فرزند صالح مولانا جعفر مسعود صاحب و دیگر افراد خانہ کا کیا حال ہوتا ہوگا؟

میرا شمار ان لوگوں میں نہیں جو مولانا واضح صاحب کے علمی و عملی رسوخ کے بارے میں کچھ گہری واقفیت رکھتے ہوں لیکن ان کی اردو و عربی کی جتنی تحریروں کے مطالعہ کا موقع ملا ان سے اس بات کا بہ خوبی اندازہ ہوا کہ وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے اس سے خود پہلے گہری واقفیت حاصل کر لیتے اور بھرپور مطالعہ و مشاہدہ کے بعد ہی وہ اسے سپرد قلم کرتے۔ ان کی تحریریں استدلالی و تجزیاتی ہوتیں لیکن اسلوب نگارش انتہائی سہل و سادہ ہوتا۔ وہ کم لکھتے لیکن جو کچھ لکھتے اس میں گہرائی و گیرائی کے ساتھ ہی ان کے سوز و دروں کی جھلک بھی صاف طور پر نظر آتی۔

عالمی منظر نامہ پر خصوصاً مشرق وسطیٰ کے حالات پر ان کی نہ صرف گہری نظر تھی بلکہ مسلمانوں کے تعلق سے ان کے پاس صرف وسوسے اور اندیشے ہی نہ تھے بلکہ خوشگوار تبدیلیوں کے لئے کچھ لائحہ عمل بھی تھے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ”فکری و قلبی واردات“ کو دوسروں تک اپنے قلم کے سہارے پہنچا کر اپنا بوجھ بھی ہلکا کرتے تھے اور ”ملی امانت“ کو ملت تک پہنچانے کا فریضہ بھی انجام دیتے تھے۔

قلم کی زبان کے ساتھ ہی اپنے منہ کی زبان سے بھی عربی اردو دونوں میں اپنے مافی الضمیر کے اظہار کا انہیں بھرپور سلیقہ تھا۔ اگرچہ ان کی کم خنی ان کی ”شیریں خنی“ کے لئے اس طرح حجاب بنی رہتی کہ ان کے کچھ بہت قریبی

شاگردوں و متعلقین کے سوا بہت ہی کم لوگوں کو اس سے واقفیت رہی کہ وہ ایک قادر الکلام اور ”سہل منتع“ میں گفتگو کرنے والے خطیب بھی تھے۔ ان کے لہجہ میں گھن گرج تو نہ تھی لیکن ان کی شگفتہ خطابت میں ”ترسیل“ کی بھرپور صلاحیت ہوا کرتی۔ مجھے ذاتی طور پر تو ان کے خطابات سے مستفید ہونے کے بہت کم مواقع مل سکے لیکن ان کے کئی شاگردوں، خصوصاً اپنے سب سے چھوٹے فرزند معاویہ عبد الرحیم فاروقی ندوی سلمہ کی زبانی ان کے زور خطابت و بیان کے متعدد واقعات سن کر ان کی ”زبان گویا“ سے بھی اسی طرح واقفیت ہوئی جس طرح ان کی ”زبان خاموش“ کا بارہا مشاہدہ ہوا تھا؟۔

نمود و نمائش سے پرہیز ہی نہیں، بلکہ اپنی شخصیت کو گم کر دینے، اور موقع بہ موقع اپنے برادر اکبر حضرت مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ کے روبرو اپنے کو ”نا قابل التفات“ گرداننے کی ان کی روش نے انہیں اس طرح ”مستور الحال“ بنا دیا تھا کہ معدودے چند لوگوں کے سوا شاید ہی کوئی صاحب نظر اس حقیقت کا ادراک کر سکا ہو کہ کم از کم عربی، انگریزی اور اردو، تین زبانوں پر مکمل عبور ہونے کی وجہ سے، اور پھر اسی کے ساتھ شخصیت کی سادگی و پرکاری کی وجہ سے ان کی وفات کے وقت ان جیسی ”جامع شخصیت“ دارالعلوم ندوۃ العلماء جیسے عالمی دینی وادبی مرکز میں بھی نہ تھی اور ان کی وفات سے جو خلا ہوا ہے اس کا پُر ہونا کچھ آسان نہیں ہے۔ و ما ذالك على الله بعزیز

اور یہ بات میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ ان تاثرات کا اپنے انداز میں اظہار دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم، عربی زبان وادب کے رمز آشا، البعث الاسلامی جیسے دنیاۓ عرب و عربی کے مقبول و معیاری رسالہ کے مدیر اعلیٰ، نیز مولانا محمد واضح صاحب مرحوم کے قریب ترین رفیق و حمیم مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن الاعظمی صاحب نے بھی کیا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میری

شہادت مولانا موصوف کے تاثرات ہی سے مستفاد ہے؟۔

مولانا مرحوم کے دو امتیازی وصف (جن کا میں نے اپنی دوسری تحریر میں بھی ذکر کیا ہے) ایسے تھے جو انہیں اپنے معاصر و ہم رتبہ لوگوں میں بھی امتیاز عطا کرتے ہیں۔

اول ان کا عربی و اردو زبانوں کے ساتھ ہی انگریزی زبان پر بھی پورا عبور اور اس زبان میں لکھنے پڑھنے کی نہ صرف قدرت بلکہ اس کا سند یافتہ ”عالم“ ہونا جس کی وجہ سے وہ مغربی افکار و نظریات اور اس زبان میں اسلام و مسلمانوں کے خلاف کی جانے والی زہر افشانیوں سے براہ راست (کسی ترجمہ اور اس کے ذریعہ مترجم کے اپنے افکار و نظریات کی دانستہ یا نادانستہ شمولیت کے بغیر) مطلع ہو کر ان اسلام و مسلم دشمنوں کے زہر کا اپنی بساط کے مطابق تریاق فراہم کیا کرتے تھے۔ اور ہمیں اس حقیقت کے اظہار میں کوئی باک نہیں کہ ہماری صف علماء میں خصوصاً ان کے معاصر علماء کی صف میں ایسے افراد شاید خال خال ہی ہوں۔

یہاں اس بات کی وضاحت ہو جانا بھی ضروری ہے کہ سطور بالا میں صرف انگریزی زبان سے واقفیت کے تعلق سے نہیں، بلکہ ”زبان پر عبور“ کے تعلق سے مولانا مرحوم کے امتیاز کا ذکر کیا گیا ہے۔ ورنہ صف علماء میں بھی انگریزی زبان میں لکھ پڑھ لینے والوں کی موجودگی سے انکار نہیں ہے۔

مرحوم کا دوسرا امتیازی وصف ”اخفائے حال و صلاحیت“ کو قرار دیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنی شخصیت پر تواضع و انکسار کے ایسے دیوار پر دے ڈال رکھے تھے کہ ان کے فضل و کمال کو تادم آخر ان کے ساتھ پاس رہنے والے کچھ بہت ہی قریبی و باصلاحیت و ذی شعور لوگوں کے سوا راقم الحروف اور اس جیسے بے شمار واقفین سمجھ ہی نہ سکے؟۔ اور پورے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس

وصف میں وہ علامہ اقبال کے اس شعر کی مکمل تفسیر تھے کہ۔

کہہ رہا تھا شور دریا سے سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

یقیناً وہ باتوفیق تھے کہ بولنے کی بھرپور صلاحیت رکھنے اور اس کا عملی تجربہ حاصل کر لینے کے باوجود بھی انہوں نے اپنی طلاق لسانی کے ذریعہ ”اپنا لوہا منوانے“ کے بجائے اپنی خاموشی و اخفائے حال کے ذریعہ یہ پیغام دیا کہ شور و غوغا مچا کر اپنے وجود کو ثابت کرنے کے بجائے خاموش رہنا نہ صرف صاحب ظرف، بلکہ باکمال ہونے کی علامت ہے۔

میں مولانا مرحوم کی عملی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہوں، پہلا وہ جو انہوں نے اپنی آل انڈیا ریڈیو سے بہ حیثیت مترجم، پروڈیوسر، اور ایڈیٹر وابستہ رہ کر ”بولتی ہوئی شخصیت“ کے روپ میں گزارا، اور اپنی اس ملازمت کے دوران اپنے ”فرائض منصبی“ سے آگے بڑھ کر اپنی جودت طبع کے ذریعہ متعدد تمثیلی و تاریخی مواد پر مشتمل پروگرام پیش کر کے عالم عرب میں اپنے ملک کا بہترین تعارف کرایا۔ اور کہا جاسکتا ہے کہ اس ”دوسری دنیا“ میں کسی مرعوبیت کے بغیر اپنے قول و عمل کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا کہ ایک مولوی اور وہ بھی ”صاحب نسبت خالص مولوی“ چھا کر رہتا ہے بچھ کر نہیں، نیز یہ کہ ارباب ہنر جہاں رہیں ”اپنی چھاپ“ چھوڑ جاتے ہیں۔ جب کہ ان کی زندگی کا دوسرا حصہ میں اسے قرار دیتا ہوں جو سرکاری ملازمت سے سبکدوشی کے بعد سے زندگی کی آخری سانس تک انہوں نے اپنی مادر علمی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بہ حیثیت استاذ، معتمد تعلیم، اور ادارہ کے ترجمان موقر عربی جریدہ ”الرائد“ کے رئیس التحریر (چیف ایڈیٹر) وابستہ رہ کر انتہائی خاموشی اور زبان رکھتے ہوئے بھی ”بے زبانی“ کے ساتھ گزارا۔ اس دوران نہ جانے ان کے کتنے ہی



مولانا کی وفات کے بعد عالم عرب کے مؤثر ترین علماء و اعیان کی طرف سے ان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کے علمی مقام و خدمات کا جس والہانہ انداز میں ذکر کیا گیا، اور پھر ان کے صرف عربی کتابوں و مضامین ہی کی جو فہرست سامنے آئی اس نے نہ صرف آنکھیں کھول دیں بلکہ ایک قسم کے

شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند مفتی سعید احمد صاحب^۲

۲۵/رمضان ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹/مئی ۲۰۲۰ء کو یہ اندوہناک اطلاع آئی کہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالنپوریؒ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

پہلے دارالعلوم دیوبند کی نسبت سے برسوں پہلے کے ایک واقعہ کا ذکر مناسب ہے جو اچانک یاد آ گیا ہے۔

ممبئی میں میری قیام گاہ پر ملاقات کے لئے میرے ایک کرم فرما اور دارالعلوم دیوبند کے ایک اچھے منصب سے علیحدہ ہونے والے خوش بیان و خوش گفتار فاضل دارالعلوم تشریف لائے۔ کچھ دیر کی رسمی گفتگو کے بعد بات ان کی دارالعلوم دیوبند سے علیحدگی کی آگئی تو انہوں نے ”عمومی رویہ“ کے مطابق دارالعلوم دیوبند کی اس وقت کی انتظامیہ، خصوصاً مہتمم صاحب کی شکایات کے دفتر کھولتے ہوئے مہتمم دارالعلوم کو اس منصب کے لئے نااہل قرار دے کر ان کی شان میں ”سوء ادبی“ کا مظاہرہ شروع کیا تو میری ”نسبت قاسمی“ نے مجھے دفاع پر مجبور کیا، اور ”حدادب میں رہتے ہوئے“ میں نے تلخ لہجہ میں گفتگو کا رخ موڑتے ہوئے مہتمم صاحب مرحوم کی کچھ ”ظاہر و باطن خوبیوں“ کا بیان

کر کے ان کی شان میں کوئی گستاخانہ بات نہ کرنے کو کہا — رعایت اس بات کی بھی ضروری تھی کہ آں موصوف مجھ سے عمر میں بڑے تھے، بعض قابل لحاظ خوبیوں کے مالک ہونے کے ساتھ ہی ”قاسمی نسبت“ کے علاوہ دارالعلوم میں ایک اچھے منصب پر فائز رہے تھے، اور پھر ان سے میرے دیرینہ خوشگوار تعلقات تھے۔ دوسری طرف دارالعلوم کی انتظامیہ خصوصاً مہتمم صاحب کے سلسلہ میں کوئی ”برہنہ تبصرہ“ میرے لئے ناقابل برداشت تھا۔ اس لئے میں نے بات چیت کا رخ دوسرے رخ پھیر دینے ہی میں عافیت سمجھی تھی۔

وہ ”زخم خوردہ“ تھے۔ پھر فطری طور پر بہت حاضر جواب اور ”مناظرانہ صلاحیتوں“ کے حامل بھی تھے، اس لئے انہوں نے اپنے موقف کی تقویت میں بہت کچھ کہا اور اس سے بڑھ کر بہت کچھ کہنا چاہا، میری کئی باتوں کا انہوں نے ”ایسا توڑ“ بھی پیش کیا کہ مجھے خاموش ہونا پڑا؟ لیکن اس موضوع کی گفتگو کا اختتام بہر حال اس طرح ہی ہوا کہ نہ وہ مجھے مطمئن کر سکے، نہ ہی میں ان کو مطمئن کر سکا۔ اب جب کہ اس گفتگو پر کئی عشرے گزر چکے۔ اس وقت کے مہتمم صاحب اور ان پر ”ترجیحی نگاہ“ ڈالنے والے وہ عالم دونوں ہی ہماری اس فانی دنیا سے رخصت ہو چکے۔ اور کہنا چاہئے کہ ”بات رفت گذشت“ ہو چکی تھی تو اچانک شیخ الحدیث مفتی سعید احمد صاحب کی وفات کی اطلاع پر اس گفتگو کی یاد اس لئے آگئی کہ آں موصوف نے اپنے موقف کی تائید میں ایک ایسی ”قیمتی بات“ کہی تھی جسے نہ میں فراموش کر سکا، نہ ہی فراموش کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ

”آپ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم کو بس کسی بڑے مدرسہ یا زیادہ سے زیادہ سب سے بڑے مدرسہ کے مہتمم کی حیثیت سے آنک رہے ہیں — حالانکہ دارالعلوم کا مہتمم پوری دنیا میں پھیلے ہوئے علماء و فضلاء و مشائخ نیز جماعت دیوبند، فکر دیوبند اور

مسلک دیوبند کے حاملین کا غیر نزاعی مقتدی و پیشوا ہوتا ہے، اور اس کی اس حیثیت کو تمام اکابر و مشائخ اور مدارس و مراکز نہ صرف بہ طیب خاطر تسلیم کرتے ہیں، بلکہ اپنے ہر قول و عمل سے اس کا اظہار بھی کرتے رہنا ضروری قرار دیتے ہیں — یعنی دارالعلوم دیوبند کے منصب اہتمام پر فائز ہونے سے پہلے رات کو سونے والا فقیر دارالعلوم کا مہتمم ہونے کے بعد صبح کو بادشاہ بن کر اٹھتا ہے۔“ (آخری پیرا گراف کے علاوہ باقی تمام الفاظ تو ظاہر ہے کہ آں موصوف کے نہیں ہیں، لیکن مفہوم کو بیان کرنے میں مکمل احتیاط اور ذمہ داری سے کام لیا گیا ہے)۔

دارالعلوم کے ”مسند نشین اہتمام“ کی نسبت سے اس بھولے بسرے واقعہ کے ذکر کے بعد، اپنی طرف سے اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ دارالعلوم کے منصب ”شیخ الحدیث“ کا معاملہ بھی جداگانہ ہے؟۔ یوں تو ہمارے مدارس کی اصطلاح میں ”شیخ الحدیث“ کسی بھی مدرسہ

کے اس مؤقر استاذ کو کہا جاتا ہے جو ”بخاری شریف“ کا درس دیتا ہو (یہ اصطلاح بھی غالباً دارالعلوم دیوبند یا مظاہر علوم سہارن پور سے شروع ہو کر فروغ پائی ہے؟ واللہ اعلم) اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ ”بخاری شریف“ جیسی کتاب کی تدریس، بجائے خود نہ صرف بڑا اعزاز ہے، بلکہ اس منصب کی ذمہ داریاں سونپنے کے لئے ہر ادارہ کے ذمہ دار خوب سے خوب تر کا ہی انتخاب کرتے ہیں۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ بخاری شریف کا درس دینے والا مدرس علم و فضل، اور تقویٰ و پاکبازی کے ساتھ ہی ”نفع رسانی“ میں یکساں نہیں ہوتا — اس کے باوجود ”شیخ الحدیث“ کو دیگر اساتذہ کے مقابلہ میں زیادہ وقعت و اعزاز حاصل ہوتا ہے، نیز تجربہ یہ بھی ہے کہ ”منصب

کی برکت“ یا درس بخاری سے وابستگی نے بیشتر اساتذہ کو اعزاز و اکرام کا ”واقعی حق دار“ بنا بھی دیا ہے۔ وَ ذَالِکَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ۔

جہاں تک دارالعلوم کا معاملہ ہے تو اس کے مہتمم ہی کی طرح شیخ الحدیث کو بھی عالمی سطح پر جو تقدس، اعتبار، اور مرجعیت کا مقام حاصل ہوتا ہے وہ کسی بھی دوسرے ”شیخ الحدیث“ کو حاصل نہیں ہو پاتا — اس کی متعدد وجوہات بھی ہیں اور اس کی ایک مستقل تاریخ بھی ہے، جس کا بیان اس وقت مقصود نہیں ہے۔

درج بالا تمہید محض اس حقیقت کے اظہار کے لئے کہ چند روز پہلے ہماری اس فانی دنیا سے رخصت ہونے والے شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب کے ذاتی اوصاف و کمالات اپنی جگہ، لیکن ان کی سب سے بڑی شناخت، اور ان کی وفات سے عالمی سطح پر تمام دینی و علمی حلقوں کے سوگوار ہونے کی بنیاد، ان کا دارالعلوم دیوبند کے منصب ”شیخ الحدیث“ پر فائز ہونا ہی ہے، جسے راقم الحروف ان کے لئے ”عطاء رب“ اور ان شاء اللہ ”ذخیرہ آخرت“ قرار دیتا ہے۔

جہاں تک حضرت مفتی صاحب مرحوم کے ذاتی اوصاف و کمالات اور ان کی ”علمی فتوحات“ کا معاملہ ہے تو اسے خوب سے خوب تر انداز میں بیان کرنے کے لئے ان کے ملک و بیرون ملک میں پھیلے ہوئے ہزار ہا ہزار شاگرد و مستفیدین ہی سب سے زیادہ اہل اور اولین حق دار ہیں، جن میں ایک سے بڑھ کر ایک با فیض، با صلاحیت، اور ہنرمند لوگ شامل ہیں — راقم الحروف جیسا ”کم آشنا“ و کم سواد تو اس علمی خسارہ اور اپنی مادر علمی دارالعلوم کے خلاء پر بس یہی کہہ سکتا ہے کہ —

شہر خالی ہوا جاتا ہے بزرگوں سے مرے
کون اب پیار سے پوچھے گا، میاں کیسے ہو؟

حضرت مفتی صاحبؒ کے تعلق سے اتنی بات کا علم تو ہر طالب علم کو ہے کہ مرحوم ایک جلیل القدر عالم، مقبول ترین مدرس، بیدار مغز مصلح، شارح قرآن وحدیث، نمونہ اسلاف، جرأت مند رہبر، اور معیاری دینی و علمی کتابوں کے مصنف تھے۔ اور ظاہر ہے کہ ان صلاحیتوں کے حامل افراد کسی بھی دور اور کسی بھی معاشرہ میں معدودے چند ہی ہوا کرتے ہیں، اور ان میں سے کسی ایک کی کمی پورے معاشرہ اور پورے دور پر اثر انداز ہوا کرتی ہے۔

راقم الحروف کی دشواری یہ ہے کہ ایک طرف دارالعلوم دیوبند سے اپنا ”روحانی سلسلہ نسب“ برقرار و بحال رکھنے کے لئے دارالعلوم کے اپنے مستند، معتمد اور باوقار شیخ الحدیث سے محروم ہو جانے کے غم میں شرکت کرتے ہوئے ”اظہار تعزیت“ ضروری ہے — دوسری طرف حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ (یعنی حضرت مفتی سعید احمد صاحبؒ) سے ذاتی و علمی روابط نہ ہونے کی وجہ سے صرف ”سنی سنائی اور لکھی لکھائی“ پر ہی اکتفا کرنا مجبوری ہے؟

راقم الحروف دارالعلوم دیوبند سے اپنی جیسی تیسری تعلیم کی تکمیل کے بعد ۱۹۷۰ء میں واپس آگیا۔ جب کہ حضرت مفتی صاحبؒ کی بہ حیثیت استاذ دارالعلوم میں آمد ان کے ایک ممتاز شاگرد جناب مولانا فضیل احمد ناصری کے بیان کے مطابق ۱۹۷۳ء میں ہوئی۔

۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۰ء تک کے عشرہ کے دوران تو راقم الحروف کا اپنی مادر علمی جانے آنے کا سلسلہ قائم رہا، اور کم از کم سال میں ایک مرتبہ اور کبھی اس سے زائد بھی دارالعلوم حاضری دینے کی سعادت ملتی رہی۔ اس مدت کے دوران مفتی صاحبؒ کا بہ حیثیت استاذ دارالعلوم میں تقرر ہو چکا تھا، لیکن ظاہر ہے کہ اپنے اساتذہ و اکابر کی موجودگی میں وہ ”دب کر رہے“ ہی پر مجبور تھے، اور وہ اس مقام و مرتبہ سے بہت دور تھے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں بعد میں عطا کیا اور جس پر فائز ہو کر وہ ہماری اس فانی دنیا سے رخصت ہوئے — لیکن ان

کے شاگردوں کے درمیان ان کے اسلوب تدریس کی خوبیوں کے چرچے اسی وقت شروع ہو گئے تھے۔ ان کی مقبولیت میں دن بہ دن اضافہ ہوتا رہا، یہاں تک کہ جب انہیں دارالعلوم کا شیخ الحدیث منتخب کیا گیا تو دارالعلوم کے طلبہ واساتذہ سے لے کر دارالعلوم سے تعلق رکھنے والے بیرونی حلقوں کی طرف سے نہ صرف اس انتخاب کی تحسین و تائید کی گئی بلکہ اسے ”حق بہ حق دار رسید“ قرار دیا گیا۔ اور حق تعالیٰ نے ان کو اس عظیم منصب کا حق ادا کرنے کی اس طرح توفیق عطا فرمائی کہ اس عظیم منصب کی نسبت سے دارالعلوم کا اختصاص و امتیاز پوری طرح باقی رہا۔

وما ذلک علی اللہ بعزیز

تدریس کے علاوہ مفتی صاحبؒ کی اضافی خوبیوں میں تقریر و خطابت، اور ملک و بیرون ملک کے علمی و اصلاحی افادات کے ساتھ ہی ان کے تصنیفی و تالیفی ذوق، اعلاء کلمۃ الحق، اور اتباع سنت کا اہتمام بھی انشاء اللہ ان کے لئے ذخیرہ آخرت ثابت ہوں گے۔

خدمت حدیث سے وابستہ ہمارے اکابر حضرت شیخ الہند، حضرت محدث سہارنپوریؒ (صاحب بذل المجہود) حضرت شیخ الاسلام اور حضرت شیخ الحدیث سہارن پوریؒ کی طرح حق تعالیٰ نے حضرت مفتی سعید احمد پالن پوریؒ کو بھی تصنیف و تالیف کا اعلیٰ ذوق عطا فرمایا تھا اور ان کے قلم سے قرآن مجید کی تفسیر اور بخاری شریف و ترمذی شریف جیسی حدیث کی کتابوں کی شروحات وجود میں آ کر مقبول عام و خاص ہوئیں — لیکن اس سلسلہ میں ان کی سب سے عظیم و ناقابل فراموش امتیازی خدمت پانچ ضخیم جلدوں پر مشتمل ”رحمۃ اللہ الواسعہ“ ہے جو مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ کی مستند ترین، مقبول ترین، اور انقلاب آفریں کتاب ”حجۃ اللہ البالغۃ“ کی شرح ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی اس کتاب کو کما حقہ سمجھنا، اور سمجھ کر دوسروں کو سمجھانا،

ہر دور میں کمال و رسوخ کی ایک دلیل گردانا گیا ہے۔ میرے دور طالب علمی میں اس کتاب کا درس اس وقت کے مہتمم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب دیا کرتے تھے۔ دارالعلوم کی مسجد قدیم میں ہونے والے اس درس میں باذوق طلبہ ہی نہیں بلکہ متعدد اساتذہ کرام بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ اور عام تاثر یہی تھا کہ اس کتاب کا حق علوم قاسمی کا ترجمان ہی ادا کر سکتا ہے۔

حضرت مفتی صاحب نے بہ توفیق الہی اس کتاب کی اردو زبان میں جو شرح لکھی اس نے برصغیر ہندوپاک میں خصوصی طور پر پذیرائی حاصل کی اور ”اپنے ویگانے“ سب ہی اس عظیم خدمت کے حوالہ سے ان کے فضل و کمال کے اعتراف پر مجبور ہوئے۔

شیخ الحدیث مفتی سعید احمد صاحب کی عملی زندگی کا ایک مثالی و قابل تقلید کارنامہ (جو ان کے اخلاص و للہیت کا شاہد عدل ہے) یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ نے انہیں جب مالی طور پر فراغت عطا کی تو انہوں نے نہ صرف دارالعلوم دیوبند سے تنخواہ لینا بند کر دی بلکہ کچھلی تمام مدت ملازمت کی لی ہوئی تنخواہ کا حساب کر کے اسے دارالعلوم کو واپس کر دیا۔ اسی طرح دارالعلوم دیوبند آمد سے قبل دارالعلوم اشرفیہ راندیر گجرات) میں دوران ملازمت لی ہوئی پوری تنخواہ کا حساب کر کے یہ رقم انہوں نے اس مدرسہ کو واپس کر دی تھی — ہماری حرص و ہوس کی دنیا میں مفتی صاحب کا یہ عمل لائق ستائش ہی نہیں، قابل تقلید ہے۔ یقیناً مفتی صاحب کی ذات سے ”کچھ نزاعات“ بھی جڑے ہوئے تھے۔ خصوصاً تبلیغی جماعت اور اس کے موجودہ امیر جناب مولانا محمد سعد کاندھلوی صاحب کے طریق کار اور ان کے کچھ بیانات پر ان کے اشکالات تھے، جنہیں انہوں نے وقتاً فوقتاً بہت ہی مدلل اور علمی انداز میں پیش کر کے اپنا ”فرض منصبی“ پورا کیا — یہ الگ بات ہے کہ ان کے اس اقدام کو ایک بڑے اور غیر علمی عوامی حلقہ میں ناپسندیدہ گردانتے ہوئے طنز و تعریض کا نشانہ بنایا گیا؟

اسی طرح مدارس، ارباب مدارس، خصوصاً اپنی مادر علمی دارالعلوم دیوبند کے سلسلہ میں ان کے ”کچھ تلخ تبصروں“ اور اکابر کے ”معمول بہا“ سے منحرف رائے کی وجہ سے کئی مواقع پر علماء نے بھی ان پر نقد کیا — تاہم ان کی علمی جلالت، دارالعلوم سے وابستہ ان کی منصبی عظمت، اور ان کے اخلاص عمل کا ہر حلقہ کی طرف سے اعتراف و احترام برقرار رہا۔

راقم الحروف کی نظر میں سب سے اہم اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ مفتی صاحب نے دارالعلوم دیوبند کے ”منصب شیخ الحدیث“ پر فائز ہو کر نہ صرف اس منصب سے وابستہ امتیاز کو باقی رکھا اور اپنے اسلاف کے نقش قدم پر گامزن رہ کر یہ ثابت کرنے میں پوری طرح کامیاب اور سرخ رو رہے کہ دارالعلوم کا شیخ بخاری صرف حدیث کی ایک عظیم الشان کتاب کا مدرس نہیں ہوتا بلکہ حدیث کے حوالہ سے اس کو اس مبارک علم و فن میں اپنا رسوخ و امتیاز بھی اس طرح ثابت کرنا ہوتا ہے کہ سارے عالم اسلام میں اس کی بات کو قدر، وقعت اور اعتبار کے ساتھ سنا اور قبول کیا جاسکے۔

مفتی سعید احمد صاحب ہماری اس فانی دنیا سے کوچ کر کے اس عالم باقی کی طرف منتقل ہو گئے جہاں وہ ہم دنیا والوں کی ہر تعریف و تنقید سے بے نیاز ہو چکے۔ ہم اپنے رب کریم سے دعا گو ہیں کہ وہ ان کے ساتھ اکرام کا معاملہ فرما کر ان کی دینی خدمات کا اپنی شان رحمت کے مطابق صلہ عطا فرمائے گا۔ اسی کے ساتھ اس کے لئے بھی دعا گو ہیں کہ حق تعالیٰ مادر علمی دارالعلوم دیوبند کو ان کا نعم البدل عطا فرما کر اس چشمہ فیض سے آب یاری کے تسلسل کو باقی رکھے۔ (آمین) —

طوفان نوح لانے سے اے چشم فائدہ؟
دوا شک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

ایک باختیار مہتمم ایسے بھی؟؟

یادش بخیر! برسر قلم وہ نام ہے جس پر محمد علی جوہر کا یہ مصرع اپنی نادانی و مردم شناسی کے اظہار کے لئے بہت موزوں و مناسب ہوگا۔
مر کے جوہر آپ کے جوہر کھلے

عالمی شہرت و احترام کے حامل تعلیمی ادارہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے مہتمم کی حیثیت سے مولانا محبت اللہ لاری صاحب کا نام ان کی امتیازی حیثیت کی حامل صفات کے ساتھ ان کی حیات اور دورِ اہتمام میں بھی کانوں میں پڑتا رہا، لیکن ان سے بالمشافہہ گفتگو کی سعادت حاصل نہ ہو سکی۔ جس کی دو بنیادی وجہیں رہیں:

اول خود مولانا کی ”کام سے کام رکھنے“ کی خو، کہ وہ کام میں یقین رکھتے ہوئے اس کی تشہیر سے اس درجہ گریزاں رہتے تھے کہ ایک سربراہ کی حیثیت سے اپنے ماتحتوں اور اپنے طلبہ کے سامنے بھی ”اپنے کارناموں“ کے اظہار و بیان کو باعثِ عار جانتے تھے۔ وہ ندوہ میں حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی جو ہر شناس نگاہوں کا انتخاب بن کر آئے اور حضرت مولانا کے رفیق درس ہونے کی وجہ سے ان کے اعتماد و احترام کے حق دار بن کر رہے۔ اور اس اعتماد و احترام کو انہوں نے کبھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ وہ اپنے ندوہ کے چوبیس برسوں پر محیط دورِ اہتمام میں ہر دل عزیز بن کر رہے۔ طلبہ و اساتذہ اور دیگر

کارکنان ہی نہیں بلکہ ندوۃ العلماء سے کسی بھی انداز سے وابستگی رکھنے والے تمام ذمہ داران بھی ان سے پوری طرح مطمئن اور خوش رہے۔ کیوں کہ انہیں کام کرنے اور کام لینے کا بھرپور و خوشگوار سلیقہ حاصل تھا۔ ان سب کے باوجود میرے جیسے ”غیر ندوی“ کو وہ کبھی شہر کی کسی مجلس یا اسٹیج پر نظر نہیں آئے۔ جب کہ ان کے ماتحت اور ان کے شاگرد برابر نظر آتے رہے۔

مولانا مرحوم سے میری ذاتی ناواقفیت کی دوسری وجہ یہ بھی رہی کہ ان کے قیام لکھنؤ کے دوران یا تو بسلسلہ حصول تعلیم میرا قیام لکھنؤ کے باہر رہا، یا پھر ایک ایسے بے شعوری کے دور میں تدریسی خدمات سے وابستہ ہو کر لکھنؤ میں قیام رہا کہ شخصیات کو پرکھنے اور ان سے استفادہ کی اہمیت کا احساس ہی نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا کے اہتمام کے دوران میرا ندوۃ العلماء جانا آنا بھی بس کبھی کبھار، اور وہ بھی حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی بارگاہ میں حاضری تک ہی ہوا کرتا تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مولانا ممدوح کی اخفائے حال کی لاکھ کوششوں کے باوجود ان کے حسن انتظام، ضبط اوقات، اور قائدانہ صلاحیتوں کی باتیں وقتاً فوقتاً میرے کانوں تک بھی پہنچ جایا کرتی تھیں۔ اور ندوہ جیسے اہمیت کے حامل تعلیمی و تربیتی ادارہ کے کامیاب و باکمال مہتمم کی حیثیت سے ان کا ”غائبانہ احترام“ میرے دل میں بھی رہا۔

مولانا محبت اللہ لاری مرحوم کی اپنی ذاتی صلاحیتیں و کمالات اپنی جگہ، لیکن یہ بالکل واضح اور ناقابل انکار حقیقت ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے منصبِ اہتمام پر فائز ہو کر بہت ہی خوبی کے ساتھ اس منصب کا حق ادا کرنے اور لگ بھگ ربع صدی کے دورانیہ میں اپنے بڑوں، اپنے ہم سروس، اور اپنے خردوں کو ہر طرح مطمئن رکھنے میں کامیابی حاصل کرنے نے ان کی شخصیت میں چار چاند بھی لگائے اور ندوی برادری کے ایک بڑے حلقہ کو اپنی طرف متوجہ ہونے پر مجبور بھی کیا۔

اس کے ساتھ یہ کہنے کی جرأت بھی کر رہا ہوں کہ ان کا دور اہتمام ان کی مادر علمی کے لئے بھی اس کے وقار میں اضافہ کا ذریعہ بنا کہ اس کا ایک فرزند جب اس ادارہ کا سربراہ بن کر منصب اہتمام پر فائز ہوا تو وہ صرف ایک عالم دین، یا دیسی الفاظ میں ”مُلا“ نہیں تھا، بلکہ اس عالمی شہرت و عزت کے حامل ادارہ میں آنے والی شخصیات سے بوقت ضرورت اردو اور عربی کے ساتھ ہی انگریزی زبان میں بھی بے تکلف گفتگو کر کے اپنے ادارہ کے مقاصد و خدمات کا براہ راست اور ”بلا واسطہ و ترجمانی“ تعارف کرا کے اپنے آنے والے مہمانوں کو حیرت بداماں بھی کر سکتا تھا۔ اور میری محدود معلومات کے مطابق اس اعتبار سے یہ ندوہ کا ”مثالی دور اہتمام“ تھا؟

مولانا لاری مرحوم نے دارالعلوم ندوۃ العلماء سے تعلیمی فراغت کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں باقاعدہ داخلہ لے کر وہاں سے ۱۹۳۶ء میں پولیٹیکل سائنس میں ایم۔ اے کیا تھا، جس کا لازمی اثر یہ تھا کہ عملی طور پر سیاسی سرگرمیوں میں کبھی حصہ نہ لینے کے باوجود ملکی و عالمی سیاست پر ان کی گہری نظر تھی اور وہ عالمی سرگرمیوں سے باخبر رہنے کے لئے انگریزی کے کسی اخبار کاروزانہ پابندی کے ساتھ مطالعہ کرتے تھے۔

آج کے دور میں علمی و معاشی رجحانات و ضروریات نے بہت بڑی تعداد میں ایسے فضلاء مدارس پیدا کر دیئے ہیں جو عصری علوم کے کالجوں و یونیورسٹیوں کی اسناد کے حامل ہو کر ان علوم میں بھی دست گاہ رکھتے ہیں، لیکن کم و بیش ایک صدی قبل ایسے باحوصلہ افراد کم ہی بلکہ خال خال ہی ہوا کرتے تھے جو دینی درس گاہوں سے باقاعدہ اسناد حاصل کرنے اور علوم اسلامیہ و عربی زبان میں مہارت حاصل کر لینے کے بعد علوم عصریہ، بہ طور خاص انگریزی زبان پر قدرت حاصل کرنے کی غرض سے کالجوں و یونیورسٹیوں کی طرف متوجہ ہوئے ہوں۔ اور پھر ان علوم پر دست رس حاصل کرنے، نیز عصری جامعات

سے ڈگریاں حاصل کر لینے کے بعد بھی وہ ”اپنی اصل“ یعنی دینی مدارس اور ان میں حاصل کردہ علوم دینیہ ہی سے وابستہ رہ کر اسلام کے آفاقی پیغام اور اس کی بے مثال تعلیمات کو ان حلقوں تک پہنچانے کا ذریعہ بنے ہوں جن کا دینی مدارس اور دینی حلقوں سے کوئی ربط و رشتہ نہ ہو؟

راقم الحروف اپنے محدود علم و خبر کی بنیاد پر اس دور کی صف علماء سے ایسی دو مثالی شخصیتوں کا نام لے سکتا ہے:-

ایک مولانا سعید احمد اکبر آبادی، اور دوسرا مولانا محبت اللہ لاری!۔
مولانا محبت اللہ لاری ایک کامیاب منتظم، ایک باسلیقہ عربی، اور دینی و عصری علوم کے جامع ہونے کے ساتھ ہی قلم کے بھی ڈھنی تھے۔ انہوں نے کم لکھا، لیکن جو کچھ اور جس موضوع پر لکھا اسے قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اور عوام ہی نہیں، اہل علم کی طرف سے بھی اس کی پذیرائی ہوئی۔ ان کی سب سے اہم تحریر اسلامی نظام مملکت پر عربی زبان کی بہت ضخیم اور مفصل کتاب ”النظم الاسلامی“ کا نہایت ہی سلیس اور رواں ترجمہ شمار کی جاتی ہے، جو انہوں نے اپنے درسی ساتھی جناب مولانا رئیس احمد جعفری صاحب کی فرمائش و اصرار پر کیا تھا اور مولانا موصوف ہی نے اپنی خصوصی نگرانی میں کراچی (پاکستان) سے شائع کرایا تھا اور اس کتاب کے مقدمہ میں انہوں نے تحریر کیا تھا کہ

”زیر نظر عربی کتاب کا ترجمہ تقریباً نو دس سال ہوئے محبت اللہ نے کیا تھا، ترجمہ تکمیل پاتے ہی میرے پاس بمبئی پہنچ گیا اس تصریح کے ساتھ کہ..... سپردم بہ تو مایہ خویش را! کراچی میں آنے کے بعد اس کتاب کا دوسرا ترجمہ نظر سے گذرا جو ہندوستان میں شائع ہوا ہے لیکن اہل نظر اور ارباب علم ان ہر دو تراجم کے دیکھنے کے بعد یقیناً محسوس کریں گے کہ زیر نظر ترجمہ

اپنی صحت، افادیت، معقولیت اور کاملیت کے اعتبار سے کہیں بلند و برتر ہے۔“

ان تمام خوبیوں کے ساتھ ہی حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی ادائیگی کے لئے وہ بھرپور طور پر کوشاں رہتے۔ ان کے طلبہ نے ان کے ذوق عبادت کا حال یوں بتایا کہ ہر نماز کی ادائیگی کے لئے سب سے پہلے مسجد پہنچنے والے مولانا ہی ہوتے تھے، بسا اوقات تو مسجد میں ان کی حاضری اذان سے بھی پہلے ہو جاتی تھی۔ ان کے تقویٰ کا یہ حال تھا کہ ہمیشہ دو قلم رکھتے تھے، دارالعلوم کے کاموں میں استعمال کے لئے ایک قلم، اور اپنی ضروریات کے لئے استعمال کیا جانے والا دوسرا قلم اور روشنائی۔ وہ مسجد میں حاضری کے لئے ٹوٹی اور چپل بھی دوسری رکھتے تھے اور مسجد سے واپسی کے بعد اتار کر رکھ دیتے تھے۔

حقوق العباد کے پاس و لحاظ کے سلسلہ میں ان کے دور کے ایک ندوی عالم نے خود مجھے بتایا کہ ایک مرتبہ کسی غلط اطلاع کی بنیاد پر مولانا کے قلم سے ان کا کھانا ایک ہفتہ کے لئے مدرسہ سے بند کر دیا گیا۔ بعد میں ندوہ کے ایک سینئر استاذ مولانا شفیق الرحمن ندوی صاحب مرحوم نے مہتمم صاحب کو میری بے قصوری اور غلط اطلاع کی بنیاد پر مہتمم صاحب کی غلط فہمی کی اطلاع دی تو مہتمم صاحب تڑپ اٹھے اور مجھے بلا کر مجھ سے اس وقت تک بار بار معافی مانگتے رہے جب تک میں نے اپنی زبان سے انہیں معاف کر دینے کی بات نہیں کہہ دی۔

اسی طرح ان ہی عالم صاحب نے اپنے سے وابستہ ایک واقعہ یہ بھی بیان کیا کہ ایک مرتبہ موسم برسات میں مولانا کا چھاتا غلط فہمی کی وجہ سے بدل گیا۔ مولانا کو جب اس کا احساس ہوا تو انہوں نے ان ہی طالب علم صاحب کو اس بات پر مامور کیا کہ وہ نماز کے بعد مسجد میں اعلان کریں کہ غلط فہمی کی وجہ سے مہتمم صاحب کا چھاتا کسی صاحب سے بدل گیا ہے۔ جن صاحب کا یہ چھاتا ہو وہ مہتمم صاحب سے مل کر اسے حاصل کر لیں۔

حسب الحکم ان طالب علم صاحب نے نماز عصر کے بعد مسجد میں یہ اعلان کر دیا، مگر اس اعلان کے باوجود کوئی چھاتا حاصل کرنے کے لئے مہتمم صاحب کے پاس نہ پہنچا۔ دوسرے دن مہتمم صاحب نے ان طالب علم کو طلب کر کے اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ تم تو بس ایک مرتبہ اعلان کر کے خاموش ہو گئے، اب مسلسل پانچوں نمازوں کے بعد یہ اعلان کرو، ممکن ہے کہ چھاتے کا مالک ہر نماز میں نہ آتا ہو اور اسے اس اعلان کی خبر نہ ہوئی ہو؟

مولانا کی یہ بے چینی اس خیال سے تھی کہ ممکن ہے کہ میرے چھاتے کے مقابلہ میں یہ چھاتا زیادہ قیمتی ہو، اور میں حق العباد کو تلف کرنے کا مجرم بن جاؤں۔ حالانکہ دونوں ہی چھاتے معمولی اور پرانے تھے۔

مولانا محبت اللہ لاری صاحب مرحوم کی پاکیزہ اور لائق تقلید زندگی کے ان چند گوشوں کو ضبط تحریر میں لا کر جہاں ”لہو لگا کے شہیدوں میں داخل ہو جانے“ کی وجہ سے مجھے مسرت ہے، وہیں میرے لئے یہ بات بھی باعث فرحت و اطمینان ہے کہ اس ٹوٹی پھوٹی اور غیر مربوط تحریر کے ذریعہ میں مولانا مرحوم کے نواسے حکیم جاوید احمد صاحب (مالیگاؤں) کی فرمائش پوری کر سکا، جنہوں نے نہ جانے کیا سوچ کر اور کس جذبہ سے مولانا مرحوم پر شائع کی جانے والی کتاب میں مشاہیر اہل علم و قلم کے ساتھ میری تحریر کو شامل کئے جانے کی ضرورت محسوس کر کے میری حوصلہ افزائی کی۔ حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ حکیم صاحب موصوف کو اس کی جزائے خیر عطا فرمائے۔ اور مولانا لاری مرحوم کو اپنے شایان کرم مقام عطا فرمائے۔ (آمین)



بھائی صاحب (پروفیسر عبدالحی فاروقی مرحوم) بہت لگتا تھا جی ان کی سنگت میں

۲ ستمبر ۲۰۱۴ء کو لگ بھگ ۱۵:۱۰ بجے شب میں جب بھائی صاحب (پروفیسر عبدالحی فاروقی مرحوم) کے اس دارفانی سے کوچ کرنے کی اطلاع ملی تو اچانک یادوں کے دریچے کھلتے چلے گئے۔ ویسے یہ خبر کوئی غیر متوقع نہ تھی۔ کم و بیش ایک برس سے تو وہ اس حال میں تھے کہ ذہن کسی وقت بھی اس خبر کو سننے کے لئے آمادہ ہو چکا تھا۔ تاہم حسرتوں اور نہ ختم ہونے والی آرزوؤں کی اس دنیا میں جب بھی اور جس عمر میں بھی ہو، کسی اپنے کی جدائی غمگین کر دیتی ہے۔ اور تمنا یہ ہوتی ہے کہ ابھی ایسا نہ ہوا ہوتا؟ فیہا حسرتا علی العباد۔

بھائی صاحب ایک بھرپور اور کامیاب زندگی بسر کرنے کے بعد کم و بیش ۷۸ سال کی عمر میں اس دارفانی سے رخصت ہوئے۔ میں اپنے چار حقیقی بھائیوں میں سب سے بڑا ہونے کے ناطے ان کا بھائی صاحب بنا۔ لیکن میرے چچا بابا کی اولاد میں مشترکہ و متفقہ طور پر بھائی صاحب تو پروفیسر عبدالحی فاروقی ہی کو کہا گیا، اور ہم میں سے کوئی بھائی بہن جب بھائی صاحب کی نسبت سے بات کرتا تو فوراً ذہن ان ہی کی طرف متوجہ ہوتا۔

وہ بہت سچ دھج کے ایک اصول پسند انسان تھے اور انہیں اپنے ”بھائی

صاحب“ ہونے کا احساس دلانے کا ہنر خوب آتا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ خشک اور رعونت پسند رہے ہوں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ خاندانی اقدار و مجلسی آداب کی پوری رعایت کے ساتھ مزاح کو برتنے اور اپنے خردوں کے لئے تفریح و دل بستگی کا سامان کرنے کا سلیقہ بھی انہیں آتا تھا۔ بس بات اتنی تھی کہ اپنے بڑوں کے ادب و احترام پر انہیں جس قدر اصرار تھا اپنے خردوں سے اسی قدر احترام کے معاملہ میں وہ حساس تھے۔

یوں تو ہمارے بھائی بہنوں میں سب سے بڑے حضرت امام اہلسنت مولانا عبدالشکور فاروقی کے فرزند اکبر مولانا عبدالغفور صاحب مرحوم کے پسر حضرت مولانا محمد عبدالاول فاروقی تھے۔ لیکن اول تو میری اور ان کی عمر کا فاصلہ اتنا تھا کہ ان کے سب سے بڑے بیٹے بھی مجھ سے عمر میں بڑے ہیں، مزید یہ کہ ان کی عمر کا بڑا حصہ لکھنؤ کے باہر خصوصاً سلطان پور میں گزرا جہاں انہوں نے ایک بڑا اور بافیض مدرسہ ”جامعہ اسلامیہ“ قائم کیا اور اسے پروان چڑھایا۔ وہ جب مستقل قیام کی غرض سے لکھنؤ آئے تو کچھ ہی عرصہ کے بعد اپنے تعلیمی سفر کے سلسلہ میں کئی برس تک میرا قیام لکھنؤ کے باہر رہا۔ اگرچہ ۱۹۷۰ء کے بعد ان کی بافیض و مشک بار شخصیت سے بھی بہ قدر ظرف فیض حاصل کرنے کے مواقع ملے، لیکن وہ بھائی بھائی سے زیادہ باپ بیٹے کے جذبہ سے؟۔۔۔ لیکن بھائی صاحب (عبدالحی فاروقی صاحب مرحوم) کا معاملہ اس سے مختلف تھا۔ وہ مجھے غیر شعوری عمر سے لے کر شعوری عمر تک ہر جگہ اور ہر محفل میں ”جان محفل“ بنے نظر آئے۔ مجھے ان کا دور طالب علمی بھی یاد ہے، پھر ”سنی ہائیر سکندری اسکول“ میں ایک استاذ کی حیثیت سے ملازمت کا دور بھی یاد ہے، اور اپنے والد ماجد مولانا عبدالمومن فاروقی مرحوم کی وفات کے بعد دہلی منتقل ہونا اور مختلف مراحل و ملازمتوں سے گذرتے ہوئے ”جامعہ ہمدرد“ کا آخری پڑاؤ اور وہاں سے بہ حیثیت پروفیسر شعبہ دینیات سبکدوش ہونے تک اور اس کے

بعد سے دم آخر تک کے بیشتر ولایتی ذکروا قعات سے مجھے پوری باخبری ہے۔
 بھائی صاحب مرحوم کے تعلیمی سفر کا آغاز بھی مدرسوں اور وہاں کی تعلیم
 ہی سے ہوا تھا اور حفظ قرآن مجید کے لئے ان کا داخلہ ”مدرسہ عالیہ فرقانیہ“ میں
 کرایا گیا تھا لیکن ان ہی کے بیان کے مطابق اس وقت کے عمومی مزاج کی کچھ
 بے جا سختیوں کی وجہ سے مدرسہ کی تعلیم سے ان کا جی اچاٹ ہو گیا تو اس وقت
 کے خاندانی ماحول میں ایک بڑا اور اہم فیصلہ لیتے ہوئے ان کے والد ماجد مرحوم
 نے عصری تعلیم کی درس گاہ یعنی اسکول میں داخل کر دیا۔ اور بھائی صاحب نے
 اپنے والد مرحوم کے اس فیصلہ کو اس طرح درست ولایتی تحسین کر دکھایا کہ اس
 وقت تک ہمارے خاندان میں عصری علوم کی سب سے اعلیٰ سندیں امتیاز کے
 ساتھ انہوں نے حاصل کیں، انہوں نے ایم۔ اے (معاشیات) اور پھر ایم۔
 اے (عربی) کی ڈگریاں حاصل کیں اور دوسرے امتحان میں تو انہیں لکھنؤ
 یونیورسٹی نے گولڈ میڈل سے سرفراز کیا۔ خاص بات یہ ہے کہ ”پٹری“ کی
 اس تبدیلی کے باوجود بھائی صاحب کی وضع قطع اور لباس میں سرمو کوئی انحراف
 نہیں آیا، اور بہت سے لوگ انہیں اس وضع میں دیکھ کر اور خاندانی نسبتوں سے
 مولانا عبدالحی صاحب ہی کہتے رہے۔ ان کی دین پسندی اور صالح اقدار سے
 وابستگی کا اثر ان کی اولاد پر بھی ظاہر ہو کر رہا، اور ان کے چاروں بیٹے اپنی وضع
 قطع، رہن سہن، اور فرائض دینی کے حوالوں سے باقاعدہ مولوی اور عالم ہی نظر
 آتے ہیں، جب کہ بڑے بیٹے عبدالملک فاروقی سلمہ (فاضل دیوبند) کے
 علاوہ تینوں بیٹے عصری علوم کی اعلیٰ سند حاصل کرنے کے بعد بہت باعزت
 و کامیاب زندگی گزار رہے ہیں اور انہوں نے ایک دن بھی کسی مدرسہ میں تعلیم
 حاصل نہیں کی ہے، مگر ان میں سے کوئی بھی اپنے سب سے بڑے بھائی کے
 ساتھ کھڑے ہو کر ان سے الگ نظر نہیں آتا و ذلک بفضل اللہ ربہ من۔

میرا اپنا ذاتی تاثر یہ ہے کہ بھائی صاحب مرحوم نے اپنا ”آئیڈیل“ تو
 اپنے والد ماجد کو قرار دیا تھا لیکن انہیں اپنے چچاؤں میں سب سے زیادہ ذہنی،
 فکری، اور علمی مناسبت میرے والد ماجد حضرت مولانا محمد عبدالحلیم فاروقی
 صاحب مرحوم سے تھی، جن کے پاس وہ اپنے قیام لکھنؤ سے لے کر قیام دہلی
 تک برابر آتے اور اکثر ان کی یہ ملاقات کئی کئی گھنٹوں تک جاری رہتی۔ وہ
 ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اپنے اسلاف اور خاندانی بزرگوں کے احوال اور ان کی
 خدمات، نیز ”تحریک مدح صحابہ“ کے سلسلہ میں علمی و تاریخی سوالات کرتے اور
 والد ماجد کے جوابات سے اپنی تشفی کا سامان کرتے۔ خصوصاً اپنی معرکہ آرا
 تصنیف ”امام اہلسنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی — حیات و خدمات“
 کی ترتیب و تسوید کے دوران تو بسا اوقات وہ کاغذ اور قلم لے کر بیٹھتے اور اہم
 امور کو باقاعدہ اپنی یادداشت کے لئے ضبط تحریر میں لاتے۔

یہ بھی ایک خوشگوار اتفاق ہوا کہ بھائی صاحب کی سب سے بڑی بیٹی کا
 عقد میرے چھوٹے بھائی عبدالولی فاروقی سے ہو گیا — اور اس کے بعد
 سے والد ماجد کے دم آخر (۱۹۹۴ء) تک تو اس مناسبت و چاہت میں اور بھی
 اضافہ ہو گیا تھا۔

بھائی صاحب کم و بیش عمر میں مجھ سے ۱۵ سال بڑے تھے۔ اس کے
 باوجود ان کے چھوٹے بھائیوں میں غالباً سب سے زیادہ ان سے بڑھ چڑھ کر
 میں ہی بات کر لیا کرتا تھا۔ میرے ٹوٹے پھوٹے لکھنے پڑھنے کے کام کے وہ
 بڑے قدردان تھے، کیوں کہ وہ خود بھی مطالعہ اور لکھنے پڑھنے کے بہت شوقین
 تھے۔ مستقل تصنیف و تالیف کی شکل میں متعدد مطبوعہ کتابوں کے علاوہ
 ہندوپاک کے مختلف جراند و رسائل میں شائع شدہ ان کے وقیع مضامین اور علمی
 و ادبی سمیناروں میں پیش کئے جانے والے مقالات ان کے اس ذوق کے آئینہ
 دار اور وافر ثبوت ہیں۔ میری ادارت میں ۱۹۷۷ء سے شائع ہونے والے

رسالہ ”ماہنامہ البدْر“ کا وہ بہت پابندی کے ساتھ مطالعہ کرتے۔ اور بسا اوقات اپنے پسندیدہ مضامین پر اظہار رائے کرتے ہوئے میری خوب خوب حوصلہ افزائی کرتے۔

میری کوئی بھی نئی کتاب چھپ کر آتی تو میں بھائی صاحب کو اپنا باشعور قدردان سمجھ کر پیش کرتا اور وہ میری بھرپور ہمت افزائی کرتے۔ اور لکھتے پڑھتے رہنے کی تاکید کرتے۔ اسے آپ میرے مزاج کی فرسودگی سے تعبیر کیجئے یا پھر ”حسن انتخاب“ سے کہ جس ماحول اور جس طرز پر میری پرورش و تربیت ہوئی اس کا اثر یہ ہوا کہ بچپن ہی سے میراجی اپنے ہم عمروں و ہم سروں سے زیادہ اپنے بڑوں میں لگا، اور اس کا ایک بڑا فائدہ مجھے یہ قول ہی گیا کہ بہت سی اچھی چیزیں مجھے پڑھائی سے نہیں بلکہ ”کڑھائی“ سے حاصل ہو گئیں۔ اسی ”افتاد طبع“ کے نتیجہ میں میراجی تو بھائی صاحب کی سنگت میں لگتا ہی تھا، خود بھائی صاحب کو بھی مجھے اپنے پاس بٹھا کر اپنی سنانے اور میری سننے میں مزہ آتا تھا۔ بیٹی کی شادی کے بعد سے بھائی صاحب جب دہلی سے لکھنؤ آتے تو ان کا قیام اپنے داماد یعنی برادر مراد عبد الولی فاروقی ہی کے گھر میں ہوتا۔ اور ملازمت سے سبکدوشی کے بعد کئی مرتبہ اس قیام کی مدت ہفتوں پر مشتمل رہی۔ اس دوران اکثر کئی کئی گھنٹے میں ان کے ساتھ گزار دیتا اور ہم دونوں میں سے کسی کو اکتاہٹ نہیں ہوتی تھی۔ کبھی کبھی دوران گفتگو وہ کرید کرید کر لکھنؤ اور کوری کے افراد خاندان کے احوال کی بھی مجھ سے جانکاری لیتے۔ کیوں کہ میرے والد ماجد کی طرح ان کو بھی افراد خاندان کی خبر گیری میں ایک خاص لذت ملتی تھی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ان کے لمبے قیام کے دوران ملاقات میں دو ایک دن کا نافع ہو جاتا تو وہ خاص طور پر کسی بچہ کو بھیج کر مجھے بلواتے اور اپنے خاص انداز میں شکوہ کرتے کہ ”کہاں تھے بھائی! میں تو تمہارا انتظار کر رہا تھا“۔ میرے والد ماجد کی وفات کے بعد کبھی کبھی ان کو بڑے پرسوز انداز میں یاد کرتے اور کہتے کہ

”چچا جان نے ہم لوگوں کے ساتھ حقیقی اولاد کا سا برتاؤ کیا، اب کہاں ایسے وضع دار لوگ؟“۔

خود بھائی صاحب کی وضع داری کا حال یہ تھا کہ موقع ملنے اور صحت کے متوازن ہونے کی صورت میں وہ برابر اپنے قیام کے دوران لکھنؤ ہی نہیں بلکہ کوری کے اعزہ واقربا سے ملاقات اور احوال طلبی کے لئے جاتے۔ یہی نہیں، بلکہ اپنے، اپنے والد اور دادا کے اہل تعلق سے بھی رابطہ قائم کرتے اور موقع ملنے پر کبھی ان کے گھر خود چلے جاتے اور کبھی انہیں اپنے پاس بلا کر رشتے اور تعلق کی تجدید کرتے۔ ایسے احباب میں چکمنڈی کے متعدد متعلقین و متوسلین کے علاوہ خصوصی طور پر بھائی نسیم الدین صاحب (پاٹانالہ) اور الحاج محمد احمد خاں ادیب صاحب (بلوچ پورہ) اور مولانا محمد اسلم ندوی (ٹلکیت گنج کنڈھا) شامل ہیں۔ اپنے نانیہال اور اب سدھیانے کے رشتے داروں میں ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد صاحب سے ملاقات کو بھی وہ بہت اہمیت دیتے تھے۔ بھائی صاحب مرحوم نے اپنے چچا جان یعنی میرے والد مولانا محمد عبدالحلیم فاروقی کی یاد میں ماہنامہ ”البدْر“ کے خصوصی شمارہ میں جو مضمون لکھا تھا، اس میں انہوں نے اپنے چچا کے حوالہ سے ایک شعر درج کیا تھا۔ آج بھائی صاحب مرحوم کی یاد میں یہ چند بے ربط سطور لکھتے ہوئے بالکل اسی جذبہ سے وہی شعر درج کر کے میں اپنی بات ختم کر رہا ہوں کہ۔

منزلوں کے سہارے گئے ☆ جو بڑے تھے ہمارے گئے
حق تعالیٰ مرحوم کی مغفرت کاملہ فرمائے اور ان کی حسنت کو اپنانے کی ہم
سب کو خصوصاً ان کی اولاد کو توفیق عطا فرمائے۔

سدا رہے نام اللہ کا

ملک زادہ صاحب کی انکساری و سادگی؟

میں کوئی شاعر نہیں، ادیب نہیں، ناظم مشاعرہ نہیں..... یعنی مرحوم ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد صاحب کا تعارف جن حیثیتوں سے کرایا جاتا ہے، ان میں سے کوئی کمال میرے اندر نہیں کہ کسی حیثیت سے اپنے آپ کو ان سے منسوب کر کے ان کے بارے میں قلم اٹھا سکوں..... اس کے باوجود مجھے ان سے عقیدت کی حد تک محبت رہی، اور میں فخر یہ طور پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ محبت ”یک طرفہ“ نہیں تھی، اسی لئے جب ”اتر پردیش اردو اکاڈمی“ کی ملک زادہ مرحوم سے منسوب خصوصی اشاعت کا اعلان ہوا تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ اردو ادیبوں کی اس محفل میں ”جایا بے جا“ مداخلت کرتے ہوئے میں بھی شامل ہونے کی کوشش کروں گا؟

ملک زادہ مرحوم کی علمی و ادبی حصولیابیوں کا اس مجلہ میں ذکر ان لوگوں کے قلم سے آنے کی پوری توقع ہے جنہیں ان موضوعات پر لکھنے کا حق و اختیار حاصل ہے اور جن کے لکھے ہوئے کو اعتبار و اعتماد کا درجہ حاصل ہے، اور مجھے پوری طرح اطمینان ہے کہ اگر اس پہلو سے کوئی کمی و تشنگی رہ گئی تو اس مجلہ کے خصوصی مہمان مدیر اور میرے انتہائی مخلص کرم فرما جناب انور جلال پوری صاحب پوری کردیں گے جن کی منجملہ سعادت آثار یوں اور خوش بختی کے ایک یہ بھی ہے کہ ذاتی شہرت و عزت، اور حلم و قار کے درجہ کمال پر فائز ہونے کے

باوجود متعدد بڑی بڑی محفلوں اور باوقار شخصیات کی موجودگی میں انہیں نے انتہائی عجز و انکسار کے ساتھ یہ اعتراف کرتے ہوئے سنا کہ میں ملک زادہ منظور صاحب کا شاگرد ہوں جس پر مجھے فخر ہے اور میں مسرت کے ساتھ اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے جو کچھ ملا اور آج میں جس مقام پر ہوں اس میں میرے استاذ محترم ملک زادہ منظور احمد صاحب کا بھرپور حصہ ہے۔

یہ تو ہوئی محترم انور جلال پوری صاحب کی ملک زادہ صاحب مرحوم سے محبت و عقیدت کی بات، لیکن لطف یہ ہے کہ ملک زادہ صاحب نے بھی اپنے اس شاگرد کے قد و قامت کا ہمیشہ لحاظ رکھا اور میں نے کبھی نہیں سنا کہ جواب میں ملک زادہ صاحب نے بھی انور صاحب کو اپنے شاگرد کی حیثیت سے مخاطب کیا ہو، یا اپنی تقریر و خطابت کے دوران انور صاحب کو ”اپنا چھوٹا“ گردانے کی کوشش کی ہو..... اور بس میں ملک زادہ صاحب سے قرابت و قدرے قربت و واقفیت کے حوالہ سے ان کی اسی روش کے سلسلہ میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جسے تو اضع و انکساری سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جسے مخلوق کے ساتھ ہی خالق بھی بہت پسند فرماتے ہیں اور تو اضع کرنے والے کو بدلے میں رفعتیں و عظمتیں عطا کرتے ہیں۔

مشہور کہاوت ہے کہ ”پھل دار درخت کی شاخیں ہی جھکی رہتی ہیں“ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ سر بلند و سرفراز لوگوں کی طرف سے تواضع دلوں کو چھوتی اور نظروں کو بھاتی بھی ہے اور مؤثر و لائق تقلید بھی قرار پاتی ہے، جیسا کہ شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ ۔

تواضع ز گردن فرازاں نکوست
گداگر تواضع کند خوئے اوست

کہ انکساری تو سر بلند و سرفراز لوگوں کو ہی زیب دیتی ہے۔ بھکاری اگر تواضع و انکساری کرتا ہے تو یہ اس کی عادت و مجبوری ہوتی ہے۔

سب ہی اس بات کو جانتے ہیں کہ ملک زادہ منظور احمد صاحب کو ان کی حیات ہی میں اعتراف و قبول اور عزت و شہرت کا وہ مقام حاصل ہو گیا تھا جو کم ہی لوگوں کے نصیب میں آتا ہے۔ ان کی شخصیت کا یہ پہلو ان کے معاصر ادیبوں و شاعروں کے درمیان انہیں امتیازی مقام عطا کرتا ہے کہ ان کے رشتے دینی حلقوں اور دینی و مذہبی شخصیات سے بھی اسی طرح استوار و خوشگوار رہے جس طرح ادبی حلقوں اور دین بے زار افراد، نیز دین فراموش اصحاب علم و قلم سے رہے۔ وہ اگر ملک و بیرون کی عظیم دانش گاہوں اور ادبی تنظیموں کی طرف سے منعقد ہونے والے پروگراموں میں ”شمع محفل“ بن کر شریک ہوتے اور ادب و شعر، نیز سماج و سیاست سے وابستہ عظیم شخصیات سے مربوط رہے۔ تو دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء، لکھنؤ، مدرسہ عالیہ عرفانیہ لکھنؤ، خانقاہ کاظمیہ کاوری وغیرہ جیسے دینی اداروں کے مختلف پروگراموں میں بھی نہایت فرحت و انبساط کے ساتھ شریک ہوتے رہے۔ نیز ممتاز دینی شخصیات مثلاً حضرت مولانا علی میاں صاحب، اور حضرت مولانا اسعد مدنی وغیرہ سے بھی انہوں نے اپنے عقیدت مندانہ و نیاز مندانہ رابطے قائم رکھنا ضروری سمجھا۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ وہ تو مجھ جیسے خرد درخرد سے ملتے تو محض دین اور علم دین کے احترام میں اپنے کو چھوٹا بنا لیتے، کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ میرے روبرو سگریٹ سلگاتے ہوئے انہوں نے مجھ سے اجازت طلب کی اور یہ کہتے ہوئے اپنے ”بڑے پن“ کی لاج رکھی کہ کیا بتایا جائے، بری لت ہے۔ وہ مجھ سے ”میرے مطلب کی“ گفتگو کر کے نہ صرف میرے لئے فرحت و دلجوئی کا سامان کرتے بلکہ اکثر دینی مسائل کا استفتا کر کے دین سے اپنی فکری و قلبی وابستگی کا ثبوت بھی فراہم کرتے۔

معلوم بات ہے کہ مشاعروں کی نظامت کو ”اپنی اختراعات“ کے ذریعہ ملک زادہ صاحب نے ہی ”ایک فن“ کا مقام عطا کیا، اور درجنوں مشاعرے ان کی اس ”فن کاری“ کے ذریعہ کامیابی سے ہم کنار ہوئے۔ پھر ان کی

تقلید و تتبع میں اور بھی متعدد با کمال ناظم مشاعرہ پیدا ہوئے اور انہوں نے شاعروں کے دوش بدوش بلکہ بسا اوقات شاعروں سے بڑھ کر اپنی دلچسپ اور سحر انگیز نظامت کے ذریعہ شاعروں کو سامعین کی ”ہوٹنگ“ سے بچا کر کلام سنانے کے مواقع فراہم کئے اور مشاعروں کو کامیاب بنانے میں کلیدی کردار عطا کیا۔ یہ صحیح ہے کہ ملک زادہ صاحب کا یہ ”فن نظامت“ اپنے پورے نکھار کے ساتھ غزل کے مشاعروں ہی میں ظاہر ہوا اور اسی حوالہ سے اس کا تعارف بھی ہوا..... مگر ایسا نہیں کہ ان کا یہ فن غزل کے مشاعروں ہی میں محدود رہا ہو، بلکہ انہیں متعدد نعت و منقبت کے مشاعروں، بلکہ سیرت و دیگر دینی عنوانات سے منسوب جلسوں میں ”دینی آداب“ کی پوری رعایت کے ساتھ شریک ہوتے اور ”فن نظامت“ کے جواہر بکھیرتے ہوئے میں نے خود دیکھا اور سنا ہے۔

میرا یہ دعویٰ ہرگز نہیں ہے کہ ملک زادہ صاحب دینی حلقوں کی کوئی نمائندہ شخصیت تھے، بلکہ مدعا صرف یہ ہے کہ تمام تر آزاد خیالیوں اور پایا بیوں کے باوجود دینی قدروں، دینی حلقوں، اور دینی شخصیتوں کا بھی وہ بے حد لحاظ و احترام کرتے تھے اور خاندانی نسبت، فکری سعادت، نیز طبعی تواضع و انکساری کی جھلکیاں اس پہلو سے بھی ان کے اقوال و کردار میں نمایاں طور پر نظر آتی تھیں۔ ان کا نانیہال ٹانڈہ ضلع امبیڈکر نگر کے محلہ الہداد پور میں تھا اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی ان کے رشتہ میں خالو ہوتے تھے، میرے چچا مولانا عبدالمومن فاروقی مرحوم بھی اسی رشتہ سے ان کے خالو ہوتے تھے جو کہ حضرت مدنی کے حقیقی ہم زلف تھے..... ایک مرتبہ میں نے ملک زادہ صاحب سے اس رشتہ کی کچھ تفصیل دریافت کرتے ہوئے ان سے پوچھا کہ حضرت مدنی سے آپ کا کس طرح رشتہ ہے اور ان کی اہلیہ صاحبہ آپ کی والدہ صاحبہ کی کیسی بہن ہیں؟ جواب میں ملک زادہ صاحب نے جو کچھ کہا تھا اس سے ان کی تواضع و انکساری، نیز دینی اقدار و دینی شخصیات کے سلسلہ میں جذبات و احترام

وعقیدت کا بہ خوبی علم ہو جاتا ہے..... انہوں نے کہا تھا کہ ”بھائی رشتہ داری تو بہت قریب کی ہے، اور اس رشتہ کے علاوہ حضرت مدنیؒ سے خاندانی طور پر دوسرا رشتہ بھی ہے۔ مگر مجھے اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے شرم دامن گیر ہوئی ہے کہ مجھ جیسا ”آلودہ عصیاں شخص“ ان پاکبازوں سے اپنا رشتہ بیان کر کے ان کی رسوائی کا سامان کرے، اس لئے جو لوگ اس بارے میں جتنا جانتے ہیں وہ جانتے ہیں، میں اپنی زبان سے اس سلسلہ میں کچھ کہنے سے احتیاط برتتا ہوں کہ وہ کیا تھے اور میں کیا ہوں؟“

ملک زادہ صاحب کی تواضع و انکساری کا ایک واقعہ تو میرے لئے ناقابل فراموش رہے گا..... یہ ۱۲ فروری ۲۰۱۵ء کی بات ہے جب جے شکر پرساد ہال، قیصر باغ، لکھنؤ میں میری نومطبوعہ کتاب ”میں نے بھی جنہیں دیکھا ہے“ کی رسم اجرا متعدد علماء و ادباء کے ہاتھوں انجام پانا تھی۔ احباب کی فرمائش و اصرار پر پہلی مرتبہ میں نے اپنی کسی کتاب کے لئے رسم اجرا کی کوئی باقاعدہ تقریب کرنے کرانے کی ہمت کی تھی۔ اس میں شرکت کے لئے میں نے فون پر ملک زادہ صاحب سے بھی درخواست کرتے ہوئے اپنی معذوریوں کے حوالہ سے جب اس بے لحاظی اور ان کے شایان شان دعوت نہ دے سکنے پر معذرت پیش کی تو انہوں نے اپنی واقعی بڑائی کا نمونہ پیش کرتے ہوئے کہا تھا معذرت کی کوئی ضرورت نہیں ہے، یہ تو آپ کا حق ہے اور آپ کی فرمائش پوری کر کے مجھے خوشی ہوگی۔ اور پھر علالت و نقاہت کے باوجود نہ صرف شروع سے آخر تک اس تقریب کو اپنی شرکت سے معتبر بنایا، بلکہ اپنی تقریر میں میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے مجھے کچھ اس طرح سراہا اور نوازا کہ میں اپنی بساط و حقیقت پر نظر کر کے شرم سار ہو گیا؟۔

اس تقریب کی نظامت میرے بچپن کے دوست اور مشہور شاعر رئیس انصاری کر رہے تھے، جنہوں نے میرا تعارف کراتے ہوئے یہ بھی کہا کہ مولانا

..... صرف عالم دین ہی نہیں ہیں بلکہ انہوں نے باقاعدہ انگریزی کی تعلیم حاصل کر کے کئی مضامین میں ایم۔ اے کی ڈگریاں بھی حاصل کی ہیں۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے انہوں نے اردو میں بھی ایم۔ اے کیا ہے اور یہ ملک زادہ منظور احمد صاحب کے شاگرد ہیں۔ (واقعہ یہ ہے کہ ملک زادہ صاحب جیسی عظیم شخصیت کی باقاعدہ شاگردی میرے لئے مایہ افتخار ہوتی، لیکن چوں کہ میں نے ایم اے اردو پیچر کنڈیڈیٹ کی حیثیت سے لکھنؤ یونیورسٹی سے پرائیویٹ طور پر کیا تھا اس لئے میں یہ سعادت حاصل نہیں کر سکا، اگرچہ میں ان کے فیض سے پوری طرح محروم بھی نہیں رہا) اب ملک زادہ کی عظمت کردار اور تواضع و انکسار پر نظر کیجئے کہ انہوں نے اپنی تقریر میں مجھ سے اپنے ربط و رشتہ کا ذکر کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ آج رئیس انصاری نے یہ انکشاف کر کے میرا سر فخر سے بلند کر دیا کہ مولانا میرے شاگرد ہیں۔ حالاں کہ مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے مجھ سے پڑھا ہے، اتنی طویل مدت میں اتنے شاگرد ہوئے کہ سب یاد نہیں ہیں لیکن ان جیسے لوگوں کا شاگرد ہونا..... وغیرہ وغیرہ۔

میں کیوں کر اس تواضع و انکسار کے مثالی نمونہ کو فراموش کر سکتا ہوں کہ جس شخص کے شاگردوں کی طویل فہرست میں دانشوروں، ادیبوں، پروفیسروں اور عالموں کی ایک لمبی قطار ہو اور جس کی شاگردی پر ناز کرنے والوں کی ایک طویل فہرست ہو، اس کا مجھ جیسے بے بضاعت کا شاگرد کی حیثیت سے ذکر سن کر اپنی ”حیثیت عرفی“ کو نظر انداز کرتے ہوئے میرے سلسلے میں ایسے ”بلند کلمات“ کہنا، میری حوصلہ افزائی اور مجھے اعتبار عطا کرنے ہی کے لئے تو تھا؟ فکر و فن اور علم و ادب کے حوالوں سے اوپر اٹھ کر بلندی کردار کی ایسی مثال اتنی قدآور شخصیتوں میں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے..... اور بس یہی ہے ملک زادہ مرحوم کا امتیاز۔ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

انور جلاپوری ایک طرح دار شخصیت

دنیا کی سب سے سچی لیکن سب سے کڑوی حقیقت کا نام موت ہے — جو سچی تو اتنی کہ اپنے خالق و مالک کے وجود کا انکار کر دینے والا ایک ملحد و دہریہ بھی موت کا انکار نہیں کر سکتا، لیکن اسی کے ساتھ کڑوی اتنی کہ جانکنی و نزاع کے عالم میں بھی سانس کی ڈور ٹوٹنے سے پہلے کوئی موت کا لفظ سننا اور اس کی نسبت اپنے کسی چہیتے کی طرف کیا جانا گوارہ نہیں کرتا؟ جب کہ ہوتا یہی آیا ہے کہ اس سچائی کو کڑوی گولی سمجھ کر بھی ہضم کرنا ہی پڑتا ہے۔

نئے عیسوی سال ۲۰۱۸ء کا آغاز ہوا تو میں ایک مقدس سفر پر ملک سے باہر ارض حرم میں تھا۔ پہلے مہینے کا دوسرا ہی دن تھا کہ اپنے ملک کی ایک عظیم شخصیت، رس بھری آواز اور ٹوٹ کے ملنے کے انداز سے ہر ملاقاتی کا دل جیت لینے والے انسان — اور پھر منفرد لب و لہجہ کے شاعر، مترجم و مصنف، نیز مشاعروں کی نظامت میں اپنا سکھ چالیس برس سے زیادہ رواں دواں رکھنے والے اپنے قدرداں و کرم فرما جناب انور جلال پوری کی خبر وفات نے جیسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا — اگرچہ برین اسٹروک کے بعد تشویش ناک حال میں

ہسپتال میں داخل کئے جانے کی خبر پہلے ہی مل چکی تھی، اور جو تفصیلات علم میں آئی تھیں انہوں نے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا، لیکن وفات کی اطلاع ملتے ہی کم و بیش دو ہفتہ قبل ہی کا وہ منظر نگاہوں کے سامنے آ گیا جب میں انور صاحب کی اکلوتی بیٹی کی وفات پر تعزیت پیش کرنے کے لئے ان کے مکان پر گیا تھا۔ وہ مشرق کی بیٹی کو خاک مغرب کے حوالہ کرنے کے بعد دو روز قبل ہی لندن سے واپس آئے تھے۔ ان کے حزن و ملال کے اثرات کو کچھ کم کرنے کی کوشش میں مجھے کامیابی بھی ملی تھی جس کا انہوں نے بڑی کشادہ دلی سے اعتراف کرتے ہوئے جب بے رنگ مسکراہٹ کے ساتھ میرا شکریہ ادا کیا تو مجھے اس احساس نے طمانیت بخشی تھی کہ نہ صرف ایک باپ کے زخمی دل پر مرہم رکھنے کی اپنی سی کوشش میں مجھے کچھ کامیابی ملی بلکہ ایک سدا بہار شخص کے حزن و ملال کو کچھ وقفہ ہی کے لئے سہی میں نے ٹال کر کچھ ثواب ضرور کمالیا۔

دوران گفتگو میری اشاعت پذیر نئی کتاب ”یادوں کے جھروکوں سے“ کا بھی ذکر آیا، جس پر مرحوم انور صاحب نے بہت ہی پر مغز مقدمہ لکھ کر میری بھرپور حوصلہ افزائی کی تھی۔ میں نے انہیں یہ بتاتے ہوئے کہ کتاب کی طباعت آخری مرحلہ میں ہے ان سے درخواست کی تھی کہ میری اس سے پہلے شائع ہونے والی کتاب ”میں نے بھی جنہیں دیکھا ہے“ کی رسم اجراء کے موقع پر آپ کے ودیگر بڑوں کے ساتھ ہی پروفیسر ملک زادہ منظور احمد صاحب مرحوم بھی تھے جواب ہماری اس فانی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اب اس نئی کتاب کی رسم اجراء کی تقریب میں آپ پر دوہری ذمہ داری ہوگی؟ تو انہوں نے بڑے انبساط و فرحت کے ساتھ اپنی روایتی انکساری سے کام لیتے ہوئے کہا تھا کہ اس تقریب میں شرکت میرے لئے باعث سعادت ہوگی، بس طباعت کے بعد جلد ہی یہ تقریب کر لیجئے گا۔ میں ضرور شرکت کروں گا — مجھے یاد نہیں کہ یہ

آخری جملہ کہتے ہوئے انہوں نے ”ان شاء اللہ“ کہا تھا یا نہیں؟ بہ ہر حال ہم غافل لوگ اپنے منصوبے بناتے رہے اور قدرت کا فیصلہ کچھ اور ہی تھا۔ اور اب صورت حال یہ ہے کہ۔

دل میں یادِ غم بے کراں رہ گئی
جانے والا گیا داستاں رہ گئی

مرحوم انور صاحب سے میرے تعلقات اور پھر قربت کی مدت کچھ بہت طویل نہیں ہے، اور پھر یوں بھی دیکھا جائے تو ہماری یہ قربتیں کچھ بے جوڑی لگتی ہیں؟ وہ ایک عالمی شہرت کے حامل ادیب و شاعر، مترجم و مصنف اور صاحب طرز ناظم مشاعرہ — اور میں بس ایک سادہ سا مولوی اور وہ بھی ”مسجد و مدرسہ کی دوڑ“ تک محدود! مگر وہ جو مشہور صداقت ہے کہ دلوں پر کس کا زور چلا ہے؟ چند ملاقاتوں ہی میں وہ قریب سے قریب تر ہی نہیں ہوتے چلے گئے، بلکہ اللہ نے ان کی نظروں میں میرا کچھ ایسا بھرم بنا دیا کہ انہوں نے اپنی منظوم ”سیرت خلفائے راشدین“ پر مقدمہ لکھنے کے لئے نہ صرف میرا انتخاب کیا بلکہ اس نسبت سے کئی مرتبہ میرے غریب خانہ پر بھی آئے — اور پھر جس طرح اپنی محبتوں کے ڈنگرے لٹائے اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا — اور اب جب کہ قضا و قدر کے فیصلہ کے مطابق اس سرائے فانی میں ان کی ملاقات سے کچھ اس طرح محروم ہوا کہ نہ ان کی نماز جنازہ میں شرکت ہو سکی اور نہ ہی ان کی آخری منزل تک پہنچانے کا واجبی حق ادا کر سکا۔ تو اس کے سوا کہہ بھی کیا سکتا ہوں کہ۔

تم سے ملنا خوشی کی بات سہی
تم سے مل کر اداس رہتا ہوں

البتہ ان کی خبر وفات ایسے مقام اور ایسے سفر کے دوران ملی کہ حق تعالیٰ

سے ان کی مغفرت اور ترقی درجات کی بھیک مانگنے کی خوب خوب سعادت مل گئی — اور یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے کام کی بات یہی ہے جس کا موقع ممکن ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کے حسن اخلاق کی وجہ سے انہیں عنایت کیا ہو؟

انور جلال پوری صاحب کی شخصیت اور فن پر ان کے قدرداں اور مرتبہ شناس لوگ لکھیں گے، اور پھر نہ یہ میرا میدان ہے نہ ہی مختصر تعارف کے ساتھ اس موضوع کا حق ادا کرنے کے لائق ہوں — تاہم اپنے ذاتی تاثر کی روشنی میں ایک جامع بات یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک قدر شناس و شائستہ انسان تھے اور ہر شخص کو اس کے مرتبہ کے مطابق برتنے کا انہیں بہت سلیقہ تھا، جس کا مشاہدہ غیر رسمی نشستوں سے لے کر عوامی جلسوں و مشاعروں میں مجھے بھی متعدد مرتبہ ہوا، اور یہ دیکھ کر رشک ہوا کہ وہ ہر محفل کے لئے ”جان محفل“ بن جایا کرتے تھے۔

مشاعروں کی نظامت کو ایک فن کا درجہ عطا کرنے والی مشہور علمی و عالمی شخصیت پروفیسر ملک زادہ منظور احمد مرحوم کو وہ بر ملا اور برسر محفل اپنا قابل احترام استاذ قرار دیتے تھے۔ اور یہ محض اس لئے کہ اس فن میں انہوں نے ملک زادہ صاحب سے اکتساب فیض کیا تھا، کیوں کہ انہوں نے ملک زادہ صاحب سے کسی درس گاہ میں زانوئے تلمذتہ کر کے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ اس کے باوجود نہ صرف انہیں وہ اپنا استاذ کہتے بلکہ استاذ والا احترام بھی دیتے تھے۔ ملک زادہ صاحب کی وفات کے بعد اتر پردیش اردو اکاڈمی نے ان کے سلسلہ میں ایک یادگاری مجلہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کی ترتیب و تدوین کے لئے اکاڈمی کے اس وقت کے چیئرمین ڈاکٹر نواز دیوبندی کو انور جلال پوری صاحب سے زیادہ موزوں کوئی دوسری شخصیت نظر نہیں آئی اور انہوں نے

باصرار یہ کام انور صاحب کے سپرد کیا جسے انہوں نے بڑی خوش دلی اور انہماک کے ساتھ انجام دیا، اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے لئے خود بھی ایک طویل و پر مغز مضمون لکھا جو غالباً اس اشاعت کا سب سے اہم اور معلوماتی مضمون قرار پائے گا۔ چوں کہ وہ ملک زادہ صاحب مرحوم سے میری قرابت و قربت سے کچھ واقفیت رکھتے تھے اس لئے اس اشاعت کے لئے فرمائش و اصرار کر کے مجھ سے بھی ایک مختصر تاثراتی مضمون لکھوا کر اسے شامل اشاعت کر کے ”یوسف کے خریداروں میں میرا نام درج کرانے“ کی بھی سعادت بخشی۔ انور صاحب کی شائستہ قدر شناسی کا یہ انداز ملک زادہ صاحب مرحوم کے علاوہ دیگر کئی لائق احترام شخصیات کے ساتھ بھی میرے مشاہدہ میں آیا۔ اور اس نسبت سے مجھے اپنے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی صداقت بھی نظر آئی کہ مَنْ أَكْرَمَ أَكْرَمَ یعنی جو دوسروں کی عزت کرے گا اسے عزت عطا کی جائے گی۔ میرا یقین ہے کہ انور صاحب کی مقبولیت و ہر دل عزیزی میں ان کے قدر شناسی کے جوہر کا بڑا حصہ رہا ہے۔ انور جلال پوری کی پایا بیوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ ان کی علمی و ادبی حیثیت کو عالمی سطح پر تسلیم بھی کیا گیا اور انہیں اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ ان کے قدر دانوں و قدر شناسوں کے حلقہ میں مسلم و غیر مسلم، سیاسی و ادبی، عوامی و حکومتی، تمام حلقوں کی شخصیات قابل لحاظ تعداد میں شامل ہیں۔ اور یہ ان کی غیر معمولی و غیر رسمی مقبولیت ہی کی بات ہے کہ وفات پر کئی مہینے گزر جانے کے باوجود اب تک ملک و بیرون ملک میں تعزیتی جلسوں کے ذریعہ انہیں خراج عقیدت و محبت پیش کئے جانے کا سلسلہ جاری ہے۔ اور میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اس مقبولیت میں سب سے زیادہ دخل اس بات کو ہے کہ انور صاحب ایک ایسے با ظرف و پامروت اور متواضع انسان تھے جن کے اندر ”آدمیت“ کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اور ان

[illegible]

ڈھونڈھان کو اب چراغ رخ زیبالے کر

دنیا سرائے فانی ہے، یہاں جو بھی آیا ہے اسے جانا ہے، ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے، موت کا ہمیں کوئی معین وقت یا علامت پہلے سے معلوم نہیں ہوتی وغیرہ وغیرہ جیسے جملے ہمارے منہ سے وقتاً فوقتاً ادا ہوتے رہتے ہیں، ہمیں ان جملوں میں بیان کئے گئے مضمون و مفہوم کا یقین بھی ہوتا ہے..... اس کے باوجود غفلتوں کے ایسے دبیز پردے ہماری آنکھوں پر پڑے رہتے ہیں کہ کسی ”اپنے“ کی موت کی خبر پا کر ہم اس طرح چونکتے ہیں جیسے یہ کوئی خلاف توقع حادثہ ہو گیا ہو..... اور پھر اس حوالہ سے کچھ وقت تک دنیا کی ناپائیداری اور اپنی موت کا بھی ”رسمی ذکر“..... رہ کر پھر وہی غفلت.....

ابھی گذشتہ ماہ کے اواخر میں چار اپنوں کی جدائی اور اس دنیائے فانی سے رخصتی پر اظہار تعزیت کر کے کچھ اپنی اور کچھ مرحومین کے پس ماندگان کے لئے تسلی کا سامان کیا ہی تھا کہ پندرہ دن کے اندر حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی صاحب، بھائی حفیظ نعمانی صاحب اور الحاج نور عالم علوی صاحب کی یکے بعد دیگرے وفات نے پے بہ پے مغموم و افسردہ کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دل کا تقاضا ہوا کہ مرحومین سے اپنے کچھ رشتوں اور اوصاف کا اختصار کے ساتھ بیان کر کے ان کے ورثاء سے تعزیت مسنونہ کرنے کے ساتھ ہی

اپنے جی کا بوجھ کچھ ہلکا کیا جائے۔

یہ ۱۹۶۷ء تا ۱۹۷۰ء دارالعلوم دیوبند کے دور طالب علمی کی بات ہے کہ حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی صاحب سے ان کے والد ماجد کے قائم کردہ کتب خانہ محمودیہ دیوبند میں پہلی ملاقات ہوئی، وہ ان دنوں دارالعلوم دیوبند کے شعبہ فارسی میں استاذ ہونے کے ساتھ ہی ایک بڑے علمی کام ”تفہیم المسلم“ کی ترتیب و تسوید میں مشغول تھے۔ اگرچہ وہ میری کم عمری اور بہت کم علمی کے ساتھ ہی اس دارالعلوم ہی کے ایک ادنیٰ طالب علمی کا دور تھا جس کے مولانا ایک لائق و مقبول استاذ تھے، اس کے باوجود محض خاندانی نسبتوں کی بنا پر مولانا ایسی شفقت و محبت کے ساتھ ملے کہ پھر بار بار ان سے ملنے کے لئے میری حاضری ہوتی رہی۔ مولانا کو اپنی بات مخاطب کی استعداد کا لحاظ رکھتے ہوئے سہل اور مرتب انداز میں پیش کرنے میں ملکہ حاصل تھا..... ان کی یہ خوبی تقریر و تحریر دونوں میں نظر آتی ہے..... عموماً ان سے بعد نماز عصر مختصر وقفہ کی ملاقات ہی ہوتی اور میری طالب علمی کی رعایت کرتے ہوئے وہ بیشتر پڑھنے پڑھانے ہی کے موضوع پر گفتگو کرتے۔ متعدد کتابوں اور اس وقت کے اساتذہ سے استفادہ کے انہوں نے کئی ”گر“ بھی بتائے جو میرے لئے بہت نفع بخش ثابت ہوئے۔

غالباً میرے قیام دارالعلوم ہی کے دوران یا اس کے کچھ ہی عرصہ بعد وہ صوبہ پنجاب کے مشہور شہر مالیر کوٹلہ میں مفتی کے منصب پر فائز ہو کر چلے گئے، میں دارالعلوم سے اپنی جیسی تیسری تعلیم مکمل کر کے اپنے وطن لکھنؤ واپس آ گیا..... اور کبھی کبھی ملاقاتوں کا یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔

اس کے بعد سے تادم واپس مولانا سے جلسوں اور سمیناروں کے سٹیج پر بالمشافہ ملاقاتیں ہوئیں اور مالیر کوٹلہ پہنچ کر مولانا نے جو ”علمی سلطنت“ دارالسلام کے نام سے قائم کی، اس کی سرگرمیوں سے بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر

مدیر ”البدر“ مولانا عبدالعلی فاروقی
کے منتخب ملکی و غیر ملکی اسفار کی رودادوں پر مشتمل کتاب

میرے سفر بھی کیا سفر؟

- ☆ سفر ناموں پر مشتمل کتابوں کی فہرست میں ایک منفرد و دل چسپ اضافہ
- ☆ سفر حرمین شریفین کی مختصر لیکن والہانہ و اشتیاق آگیز رودادیں
- ☆ چند بیرونی اسفار کے ساتھ ہی ملک کے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کے متعدد مقامات کے سفر نامے
- ☆ اپنے ہی ملک کے مختلف علاقوں کی مختلف تہذیبوں، کھان پان، اور رہن سہن کی جھلکیوں کا ایک مرقع
- ☆ سفری رودادوں کے ساتھ ہی اور بھی بہت کچھ سامانِ نشاط فراہم کرانے والا مواد
- ☆ مسافر کے اپنے مخصوص انداز نگارش، اور دل چسپ انداز بیان میں ایک نئی کتاب، نئی ترتیب، خوبصورت کتابت و طباعت، اور دیدہ زیب و جاذب نظر، چار رنگے سرورق کے ساتھ
- ☆ عام قیمت: دو سو (۲۰۰) روپے (طلبہ و تاجران کتب خصوصی رعایت کے لئے فون نمبر 9450110463, 9839181475 پر رابطہ کریں)
- ☆ جلدی کریں۔ کتاب کی اشاعت بہت محدود تعداد ہی میں ہوئی ہے۔

ملنے کا پتہ

مکتبہ البدر، کاکوری، لکھنؤ-۲۲۶۱۰۱ (یو پی)

MAKTABA AL-BADR
KAKORI, LUCKNOW-226101 (U.P.)

مجھے استفادہ کے مواقع ملتے رہے۔ پھر یہ ہوا کہ انہوں نے اپنے مرکز کے ترجمان کے طور پر دارالسلام ہی کے نام سے ماہانہ رسالہ جاری کیا اور میرے رسالہ البدر سے اپنی طرف سے پہل کر کے تبادلہ شروع کر دیا اور تبادلہ ہی نہیں میری عزت افزائی یا حوصلہ افزائی کے لئے البدر میں شائع ہونے والے میرے مضامین وقتاً فوقتاً نقل کر کے دارالسلام میں شائع کرتے رہے..... اور اس واسطے سے ہمارے رشتہ کو ایک بار پھر تحریک مل گئی، اگرچہ وہ ”قلمی“ رشتہ ہی رہا۔ مولانا نے اپنی متعدد تصانیف البدر میں تبصرہ کے لئے بھیجیں..... اور مجھے ان کی تحریروں سے مستفید ہونے کے مواقع ملتے رہے۔

مولانا ہلال عثمانی مرحوم ایک ممتاز علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ وہ اپنے آباء صالحین کی علمی و تہذیبی روایات کے امین و محافظ بھی تھے۔ شکل و صورت اور لباس سے لے کر مخاطب و تعلم اور بود و باش تک ہر چیز میں ان کی نسبی و طبعی شرافت کی جھلک نظر آتی تھی۔

برسوں سے کوئی براہ راست رابطہ و ملاقات نہ ہونے کی وجہ سے ان کی علالت کی بھی کوئی اطلاع نہیں مل سکی تھی، بس اچانک ہی اخبارات کے ذریعہ انتقال پر ملال کی اطلاع ملی۔ حق تعالیٰ مغفرت کاملہ سے نوازے۔ آمین۔



حفیظ نعمانی: ایک صحافی، ایک انسان!

۹ دسمبر کو ملک کے نامور ادیب و صحافی حفیظ نعمانی صاحب بھی ہماری اس فانی دنیا کو چھوڑ کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حفیظ نعمانی مرحوم کو ان کی موجودگی ہی میں نہیں ان کی غیبت میں بھی میں نے ”حفیظ بھائی“ ہی کہا — یہ اور بات ہے کہ اپنی خوش طبعی، خوش فکری، اور خوش اخلاقی کے ذریعہ انہوں نے اپنے آپ کو ”بڑے بھائی“ کے جنجال سے چھڑانے کی ہمیشہ کوشش کی۔

بلاشبہ حفیظ نعمانی اردو کے ایک ایسے بے باک، بے لوث، اور با وزن صحافی و تجزیہ نگار تھے جن کا متبادل و ہمسر دور دور تک نظر نہیں آتا۔ حالات حاضرہ پر ان کی جتنی گہری نظر رہتی اسے اپنے قارئین کے سامنے پیش کرنے کا اس سے بڑھ کر انہیں سلیقہ تھا۔ کوئی بازوق قاری ان کے دو چار مضامین یا ادارے پڑھ لیتا تو اسے حفیظ نعمانی کو پڑھنے کا چرکا لگ جاتا۔ حفیظ بھائی کی اخبارات سے وابستگی کسی ذاتی غرض یا معاشی ضروریات کی تکمیل کے لئے نہیں ہوتی تھی بلکہ اپنے واردات قلبی کے اظہار یا اپنے ذہنی بوجھ کو تقسیم کر کے کچھ اپنے کو ہلکا کرنے اور کچھ دوسروں کی آنکھیں کھولنے کے لئے ہوا کرتی تھی۔ وہ اخبارات کے مالکان و مدیران کی کسی ”پالیسی“ یا بالفاظ دیگر ”مصلحت“ کی قید سے اپنی آزادی اور ”اظہار رائے“ پر کسی قسم کا قدغن نہ لگنے کی منظوری حاصل کئے بغیر کسی اخبار سے وابستگی گوارہ نہیں کرتے تھے — یہی وجہ ہے کہ کسی ایک اخبار سے ان کی وابستگی

بہت طویل نہیں ہو پاتی تھی، اور جوں ہی حفیظ بھائی یہ محسوس کرتے کہ اخبار کے مالک یا مدیر کو یہ ”غلط فہمی“ ہونے لگی ہے کہ اخبار اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا ہے اور حفیظ بھائی کی تحریریں اخبار کی بقا کے لئے ناگزیر نہیں رہ گئی ہیں — حفیظ بھائی خاموشی کے ساتھ اس اخبار سے علیحدہ ہو کر اپنا ہاتھ اور اپنا قلم اس ”نوآموز طالع آزمایا“ کو تھما دیتے جو دیر سے اسی ”روز سعید“ کی آمد کا منتظر ہوتا تھا، اور حفیظ بھائی ”اپنی شرائط“ بلکہ خود ان کے ہی اس راقم الحروف سے کہے گئے الفاظ میں صرف ایک ”دُم پر پیر رکھنے کی شرط“ کے ساتھ پوری سچائی اور لگن کے ساتھ اس اخبار کو بڑھانے اور قارئین کو اس کا عادی بنانے میں جٹ جاتے۔

حفیظ بھائی نے ”تحریر فروشی“ کا پیشہ بھی نہیں اپنایا، اپنے اخبار میں لگے تو وہ گھائے پر چلتا رہا اور ”اپنا شوق“ پورا کرتے رہے۔ دوسروں کے اخباروں سے وابستہ ہوئے تو کسی اجرت کے بغیر صرف ”دُم پر پیر رکھنے“ کی شرط کے ساتھ؟

حفیظ نعمانی کھری بات کہنے اور کھری بات لکھنے کے عادی تھے اور اپنی اس ادا کو انہوں نے اپنی زندگی کی آخری سانس تک نبھایا — اس کے باوجود ان کی تحریر اور اس سے زیادہ ان کی گفتگو میں ایک ایسی چاشنی ہوتی تھی کہ ان کو پڑھنے اور سننے والا کھوکھلا جاتا تھا۔ وہ جس پر جرح و تنقید کرتے اگر وہ ان کی پوری بات سن لیتا یا پڑھ لیتا تو اگر اعتراف نہیں تو خاموش رہنے پر تو مجبور ہو ہی جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے مستقل طور پر ناراض رہنے والوں کی تعداد میرے خیال میں انگلیوں پر شمار کئے جانے کے لائق بھی نہ رہی ہوگی۔

مجھے اس بات کا بھی علم ہے کہ حفیظ نعمانی کسی فرشتہ کا نہیں، بلکہ ایک انسان کا نام تھا۔ ان کے زندگی گزارنے کے انداز اپنے والد بزرگوار حضرت مولانا محمد منظور نعمانی اور ان کے خاندان کے دیگر چھوٹے بڑے ”ثقتہ افراد“ سے مختلف تھے۔ ان کا ”حلقہ احباب“ بھی خاندان کے دیگر افراد، حتیٰ کہ اپنے ہی تینوں بھائیوں سے جدا گانہ تھا۔ انہوں نے اگرچہ اپنی ابتدائی عمر میں اپنے بڑے بھائی مولانا عتیق الرحمن کی طرح بلکہ ان کے ساتھ ساتھ عربی مدارس میں

داخلہ لے کر دینی تعلیم حاصل کی تھی — لیکن انہوں نے اپنی ہیئت اور وضع قطع سے لے کر اپنی تحریروں و تقریروں تک، کہیں اس کی جھلک نہیں آنے دی کہ ”اس میدان“ سے بھی ان کو کوئی رشتہ ہے؟

ان کی شناخت ایک مذہبی اسکالر کے بجائے ایک صحافی اور ادیب کی حیثیت سے ہوئی — جب کہ میری اپنی ذاتی معلومات کے مطابق ان کی جو کچھ تعلیم (ایک رسمی طالب علم بن کر) ہوئی وہ دینی مدارس خصوصاً دارالعلوم ندوۃ العلماء ہی میں ہوئی۔ اس طرح انہیں فطری طور پر ”مولانا“ اور مولاناؤں کا ہم نشین ہونا چاہئے تھا؟ لیکن ان کے بے تکلف احباب، اور ”حلقہ یاران“ میں شاید ہی کوئی خاندان یا خاندان کے باہر کا ”مستند و معتبر عالم دین“ رہا ہو؟۔ ان سب کے باوجود حفیظ بھائی کی شخصیت کا یہ کمال یا پھر ”تضاد“ تھا کہ ان کا اپنے مذہب و مسلک، دینی اداروں و دینی شخصیات، اپنے والد ماجد اور ان کے حلقہ اثر و نفوذ، اور اپنے خاندان و خاندان کی مقتدر شخصیات کے ساتھ مضبوط رشتہ بنا رہا۔ وہ نہ کسی کے لئے ”اجنبی“ رہے، نہ ہی انہوں نے رشتوں کے آداب و احترام کے سلسلہ میں کوئی فروگزاشت کی۔ ”ان کی دنیا“ الگ ضرور تھی۔ لیکن اس کے اندر ”احساس برتری“ کا کوئی عنصر نہیں تھا — بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ موقع بہ موقع وہ اس کا اظہار بھی کر دیا کرتے تھے کہ ”اصل دنیا“ تو ان کے والد ماجد اور ان کے اسلاف صالحین ہی والی ہے۔ اور اس سے دوری و مجوری پر وہ ”کف افسوس“ بھی مل لیا کرتے تھے؟۔

راقم الحروف کو اپنے خاندانی حوالوں سے بھی اس کا علم ہوا، اور حفیظ بھائی مرحوم نے بھی بہت تفصیل کے ساتھ بتایا کہ ان کے والد ماجد حضرت مولانا محمد منظور نعمانی نے بریلی سے لکھنؤ کی طرف ہجرت میرے جد بزرگوار امام اہل سنت حضرت مولانا محمد عبدالشکور فاروقی کی تحریک پر اور ان ہی کے زیر اثر کی تھی، اور لکھنؤ میں ان کا پہلا پڑاؤ امام اہل سنت کے ادارہ ”دارالمبلغین“ ہی میں ہوا تھا۔

پھر لکھنؤ میں رہتے رہتے ان کے روابط و رشتے حضرت مولانا علی میاں صاحب، دارالعلوم ندوۃ العلماء، مبلغی جماعت اور اس کے مرکز و اکابر سے قائم ہوئے — اس طرح ہمیں یہ کہنے کا حق ہے کہ حفیظ بھائی (جو خود ان کے اپنے بیان کے مطابق اس وقت کم عمر بچہ تھے) اور ان کے والد ماجد سے لکھنؤ میں سب سے پہلا اور سب سے قدیم رشتہ (اور وہ بھی دینی و فکری بنیادوں پر) ہمارا اور ہمارے خاندان ہی کا ہے — دوسرے سب بعد کے ہیں؟ یعنی —

میں کون کیا ہوں، میری تحریر کہے گی
خاموش ہوا تو، مری تصویر کہے گی

مناسب ہوگا کہ اپنے اس ”دعویٰ“ کا ثبوت فراہم کرنے کے لئے اس جلسہ کا ذکر کر دیا جائے جو حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کی وفات کے بعد ان کی تعزیت کے لئے قیصر باغ بارہ درہی لکھنؤ میں حضرت مولانا علی میاں صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ اس موقع پر حفیظ بھائی کی خواہش و دیگر کچھ احباب کے اصرار پر میں نے حضرت مولانا مرحوم کی شخصیت اور ان کی وفات سے ہونے والے خلا کو اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہوئے اور حضرت صدر محترم کو گواہ بناتے ہوئے اس حقیقت کو بھی بیان کیا تھا کہ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی لکھنؤ کب اور کس کی تحریک پر آئے؟ اور یہاں آنے کے بعد ”مدح صحابہ مشن“ میں انہوں نے کیوں کراپنا تعاون پیش کیا؟۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کا اگرچہ دارالمبلغین سے رسمی رشتہ ختم ہو گیا تھا، لیکن ہمارے خاندانی بزرگوں سے ان کے روابط و رشتے قائم رہے۔ پھر میرا بھی ان کی خدمت میں کبھی کبھی جانا ہوتا تھا۔ نظیر آباد لکھنؤ کے جس مکان میں مولانا کا آخر عمر میں قیام تھا، اس میں ان کے ساتھ ان کے دونوں چھوٹے بیٹے مولانا محمد حسان نعمانی، اور مولانا سجاد نعمانی بھی رہتے تھے۔ جب کہ حفیظ بھائی اپنے بچوں کے ساتھ گونگے نواب پارک سے متصل اس مکان میں رہتے تھے جس کے نیچے کی منزل میں ان کا ”تنویر پریس“ اور اس کا

دفتر تھا۔ سب سے بڑے بھائی مولانا عتیق الرحمن صاحب اپنی علالت کی وجہ سے مہلین کی تجویز پر لندن میں مقیم ہو گئے۔ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کے ساتھ رہنے والے ان کے دونوں بیٹے ماشاء اللہ عالم بھی تھے، کم و بیش ہم عمر بھی۔ اور بھائی حسان سے تو ایک خصوصی رشتہ یہ بھی تھا کہ ہم دونوں نے ایک ساتھ ایک ہی کالج میں داخلہ لے کر بی۔ اے کیا تھا۔ اور وہ میرے کلاس فیلو یعنی رفیق درس بھی تھے۔ پھر اکثر حاضری کے موقع پر ان دونوں سے یا کسی ایک سے ملاقات بھی ہو جایا کرتی تھی۔ جب کہ اس وقت تک حفیظ بھائی سے بس کبھی کبھار ملاقات ہونے پر سلام و دعا ہو جاتی — لیکن اسے احساس کی فرما دوائی کہنے یا نگاہوں کے طلسم سے تعبیر کیجئے کہ چلتے پھرتے کی اس کبھی کبھار کی سرسری ملاقات کے وقت بھی حفیظ بھائی کے چہرہ کی شادابی اور لبوں کی مسکراہٹ ”بہت قریبی“ ہونے کا احساس دلا جاتی تھی؟ پھر وہ وقت آیا کہ میرا رسالہ ”البدر“ حفیظ بھائی کے ”تنویر پرلیس“ میں چھپنے لگا، اور اس بہانے حفیظ بھائی سے ملنے ملانے اور ان کی معلوماتی و پر لطف باتوں سے محفوظ ہونے کے مواقع ملنے لگے۔ یہ وہ وقت تھا جب حفیظ بھائی پوری طرح صحت مند، ہشاش بشاش اور یوں کہنا چاہئے کہ ”ورکنگ آرڈر“ (Working Order) میں تھے۔ اگرچہ پرلیس کا کام کاج سنبھالنے کے لئے ان کے بیٹے شمعون نعمانی کافی تھے۔ لیکن اپنی دلچسپی یا ”اپنی محفل گرم کرنے“ کے لئے حفیظ بھائی پابندی کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے۔ میری اور مجھ جیسے کئی لوگوں کی دلچسپی بھی پرلیس سے زیادہ حفیظ بھائی کی ذات میں تھی۔ اسی لئے میں اکثر مہینے میں کئی کئی بار جاتا اور کافی کافی دیر تک حفیظ بھائی کی سچی، خاندانی، علمی، ادبی، اور سیاسی موضوعات پر ہونے والی گفتگو اور انداز گفتگو سے شاد کام و محفوظ ہوتا — حفیظ بھائی کی مجلس کی خاص بات یہ تھی کہ گفتگو چاہے کسی بھی موضوع پر، اور کتنی ہی طویل ہو — کسی کو اکتاہٹ یا ملال نہیں ہوتا تھا۔ اور جب مجلس برخواست ہوتی تو سب اسی طرح ”تازہ دم“ اٹھتے تھے جیسے آغاز کے وقت ”تازہ دم“ بیٹھتے تھے؟؟

حفیظ بھائی جس مجلس میں ہوتے اپنی شگفتہ روئی اور اپنی شستہ و پُر بہار گفتگو کے ذریعہ جان محفل بنے رہتے۔ وہ اپنے چھوٹوں کی رعایت بھی کرتے، اور ان کی تربیت کا بھی بے حد لحاظ رکھتے — یہی وجہ ہے کہ جس طرح وہ خود اپنے تمام بھائیوں میں اپنی نرالی شان کے ساتھ منفرد رہے اسی طرح ان کے صاحبزادگان بھی اپنے والد مرحوم کے نقش قدم پر ہیں۔

آخر میں حفیظ بھائی کی تعلیم و تربیت اور دوسروں کی رعایت کی مثالی و موثر جلوہ گری کے نمونہ کے طور پر اس واقعہ کو پیش کرنا مناسب ہے کہ حفیظ بھائی کی وفات کے ۲-۳ دن بعد ایک شام ان کے چھوٹے بیٹے ہارون نعمانی کا فون آیا اور انہوں نے اپنی اور اپنے سب سے بڑے بھائی شمعون نعمانی کی مجھ سے ملاقات کی خواہش کرتے ہوئے اسی وقت آنے کی اجازت طلب کی؟ اور پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد دونوں بھائی میرے گھر آ گئے۔ اور آنے کا مقصد شمعون نعمانی نے جو بیان کیا وہ یہ کہ ہم لوگ آپ کے پاس اپنے ابو صاحب کی تعزیت کرنے آئے ہیں؟ میں نے سٹپٹا کر اپنی کھٹنوں کے درد کی معذوری اور علالت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ”مجھے پھر تم لوگوں کے پاس آنا چاہئے تھا — یہ تم لوگوں کی سعادت مندی ہے کہ تم خود چل کر میرے پاس تعزیت کے لئے آئے۔ جواب میں انہوں نے کہا نہیں، حقیقتاً ابو صاحب کی وفات پر تعزیت کے حق دار تو آپ لوگ ہی ہیں جو ان کے ہم نشین و قدر دان رہے۔ اسی لئے ہم لوگوں نے اپنی واقفیت کے مطابق ان کے تمام احباب کے گھر جا کر ان سے تعزیت کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں نے ان دونوں بھائیوں کو اور ان کے واسطے سے ان کے تمام افراد خانہ کو تعزیتی کلمات پیش کرتے ہوئے یہ اعتراف کرنا بھی ضروری سمجھا کہ — بس یہی تھیں حفیظ بھائی مرحوم کی ”امتیازی ادائیں“ اور یقیناً یہ ان ہی کی تربیت کا نتیجہ ہے کہ آج ”تم“ لوگ خوشی خوشی الٹی گنگا بہا رہے ہو — ورنہ ایسے مواقع پر تو لوگ اس پر نگاہ رکھتے ہیں کہ ان کے گھر کون تعزیت کے لئے آیا اور کون نہیں؟ — حق تعالیٰ اپنے خصوصی فضل سے مرحوم کی مغفرت کا ملہ فرمائے۔ (آمین)

خواجہ یونس مٹے بھی تو اک داستاں ہو گئے ہم

۴ مارچ ۲۰۱۹ء کو اپنے شہر لکھنؤ کی ایک منفرد اور فعال شخصیت ڈاکٹر خواجہ محمد یونس صاحب بانی نیجر ارم ایجوکیشنل سوسائٹی کی اچانک ہماری اس فانی دنیا سے رحلت کی الم ناک خبر ملی۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

یوں تو خواجہ صاحب مرحوم ایک لمبے عرصہ سے مسلسل ضعف و اضمحلال اور مختلف قسم کی بیماریوں کے شکار تھے، لیکن وہ اپنی ہمت و ارادہ سے اپنے کو ”باکار“ بنائے ہوئے تھے۔ صاحبزادگان کے بیان کے مطابق ۳ مارچ کے دن اور پھر آنے والی شب تک بھی نقاہت و کمزوری کے سوا کوئی ایسی علامت نہ تھی کہ افراد خانہ کو بھی اتنی جلدی ان کی جدائی کا خیال ہوتا، لیکن مشیت ایزدی کے مطابق ۴ مارچ کی صبح ہوتے ہوتے رات میں قریباً ۳ بجے انہوں نے اس دنیائے فانی میں اپنی زندگی کی آخری سانس لی۔ اور اس طرح عزم و ہمت اور جدوجہد سے بھرپور ایک زندگی کا آخری باب لکھ دیا گیا، اور یہ حقیقت ہم غافلوں کے سامنے ایک مرتبہ پھر نکھر کر آگئی کہ ۔

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

راقم الحروف کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ خواجہ یونس مرحوم سراپا خیر تھے، اور ان سے کسی کو کبھی کوئی شکایت نہ رہی ہو، لیکن وہ اب ہم بندوں کے شکوہ و شکایت اور تعریف و تنقید کی دنیا سے آزاد ہو کر اپنے اس مالک حقیقی کے حضور پہنچ چکے جس کا معاملہ یہ ہے کہ ۔

رحمت حق بہا، نہ جوید

رحمت حق بہانہ جوید

خواجہ صاحب مرحوم سے راقم الحروف کے شعوری تعلق و رشتہ کی مدت بھی کم و بیش نصف صدی کی ہوگی اور راقم الحروف ان کی داستاں زندگی کو سمیٹ کر بس اتنا ہی کہہ سکتا ہے کہ اس نے مرحوم کو ”زیر و سے ہیر و“ بننے دیکھا ہے۔ ان کی تمام تر صلاحیتوں اور پایا بیوں کا سرعنوان ”عزم و حوصلہ“ کو قرار دینا مناسب ہوگا۔ راقم الحروف سے ان کی شناسائی اس وقت ہوئی جب وہ انجمن تعلیمات دین ضلع لکھنؤ میں قلیل مشاہرہ کے ساتھ آرگنائزر کے منصب پر ملازم تھے اور لکھنؤ شہر سے ملیج آباد تک لگ بھگ ۲۵ کلومیٹر کا سفر سائیکل سے کیا کرتے تھے۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ نہایت ہی بے سروسامانی کے عالم میں انہوں نے ”ارم ایجوکیشنل سوسائٹی“ قائم کی اور اس کے ماتحت ”ارم گرلس اسکول“، لکھنؤ کے محلہ بارود خانہ کے اپنے رہائشی مکان ہی کے ایک حصہ میں قائم کیا۔ ان کے عزم و حوصلہ کو یقینی طور پر بارگاہ خداوندی سے شرف قبول ملا۔ اور پھر ایک کے بعد دوسرا اور تیسرا ادارہ لکھنؤ اور اپنے وطن ضلع بارہ بنکی میں وہ اس طرح قائم کرتے گئے کہ ہر ادارہ کی اپنی نجی بلڈنگ بھی بنتی گئی۔ اور اب جب کہ وہ ہماری فانی دنیا سے رخصت ہوئے تو کم و بیش پچاس تعلیمی ادارے چھوڑ کر گئے جس میں دینی مدارس کے ساتھ ہی ڈگری کالج، بی ایڈ و بی ٹی سی کے ادارے نیز بی یو ایم ایس کا منظور شدہ و ترقی یافتہ کالج اور اب ایم بی بی ایس کی تعلیم کے لئے قائم کیا جانے والا کالج بھی شامل ہے اور ان تعلیمی اداروں میں بلاشبہ ہزاروں

لڑکے اور لڑکیاں تعلیم حاصل کر رہی ہیں اور سیکڑوں گھرانوں کی روزی روٹی ان اداروں سے وابستہ ہے۔ دیگر تمام باتوں سے قطع نظر خالص انسانی نقطہ نظر سے خواجہ صاحب مرحوم کی فروغ علم اور افراد سازی کی اس کاوش سے کیوں کر انکار کیا جاسکتا ہے؟

ہمارے علم میں یہ بات ہے کہ خواجہ صاحب کا کام کرنے کا اپنا انداز تھا۔ اور اس ”انداز کار“ سے بہت سے لوگوں کو شکایات بھی رہیں؟ مجھے نہ اس کا حق ہے کہ میں ان شکایات کا تجزیہ کروں، نہ ہی اب جب کہ خواجہ صاحب ہماری اس فانی دنیا سے رخصت ہو چکے، ایسے کسی تجزیہ کا کوئی حاصل و نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے؟ — البتہ قابل غور بات یہ ہے کہ وہ جو درجنوں کی تعداد میں تعلیمی ادارے چھوڑ کر اس دنیا سے گئے ہیں، ان کا نفع عام لوگوں تک بھی پہنچے گا یا نہیں؟ صرف پیسہ کمانا ہی اگر ان کا مٹح نظر ہوتا تو وہ ایک کے بعد ایک تعلیمی ادارے قائم کرنے کے بجائے کوئی ایک ”فیکٹری یا کارخانہ قائم کر کے اپنی اور اپنی نسلوں کے لئے مال و دولت اکٹھا کرنے کا انتظام کر سکتے تھے؟ مجھے اس سے انکار نہیں کہ انہوں نے مختلف نوعیت کے تعلیمی ادارے قائم کئے، اور آج کے مروجہ چلن کے اعتبار سے ان میں سے کئی اداروں سے انہوں نے مالی منافع بھی حاصل کئے — لیکن کوئی تو وجہ ہوگی کہ انہوں نے بس فروغ علم کے ادارے ہی قائم کرنے پر اپنی توجہ کو مرکوز رکھا؟

کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونا چاہئے کہ میں خواجہ صاحب کا ”وکیل صفائی“ بن کر ان کی بے جا تعریفوں کے دفتر کھولنا چاہتا ہوں؟ بفضلہ تعالیٰ خواجہ صاحب سے میرے بہت خوشگوار تعلقات رہے، لیکن ”بے غرضانہ“ ہی رہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کی بعض ادائیں ایسی تھیں جو نہ صرف پرکشش بلکہ لائق تقلید تھیں — مثلاً یہ کہ مال و دولت کی فراوانی، اور ہر قسم کے سامان آسائش و آرائش مہیا ہونے کے باوجود انہوں نے نہ اپنی ابتدائی زندگی کے غربت و افلاس کو

فراموش کیا نہ ہی اس دور کے احباب و اقرباء کو۔ ”نودولتوں“ میں عموماً جو تمکنت پیدا ہو جاتی ہے، اور وہ ”اپنے ماضی“ سے پیچھا چھڑانے کے لئے ماضی کے آثار ہی نہیں، ماضی کے احباب و ”حلقہ احباب“ سے فاصلہ بنالینا ضروری سمجھنے لگتے ہیں — اس کا خواجہ صاحب کے یہاں دور دور تک گزر نہیں تھا۔ وہ جس سے ملتے کھل کر اور ٹوٹ کر ملتے اور کسی کو یہ الزام لگانے کا موقع نہیں دیتے کہ ”خواجہ صاحب بدل گئے ہیں؟“

ان کی ایک قابل ذکر ادائیہ بھی تھی کہ وہ ”اپنے مفادات“ کے تحفظ اور ان کے حصول کے لئے تو بہت چاق و چوبند رہتے، لیکن اس سلسلہ میں ان کی سوچ مثبت تھی، یعنی وہ اپنے مفاد پر تو نگاہ رکھتے لیکن کسی کو نقصان پہنچانے یا کسی دوسرے کے مفادات کے حصول کی راہ میں حارج بننے کو وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ بلکہ انہیں بس ”اپنے کام سے کام رہتا“ دوسروں کی راہ کا روڑہ نہیں بنتے تھے۔ ذاتی اور نجی زندگی کے سلسلہ میں میرا اپنا مشاہدہ و تجربہ یہ رہا کہ وہ اپنی عزت کروانے سے زیادہ دوسروں کی عزت کرنے کو پسند کرتے تھے اور اس کے لئے ”تقریب بہر ملاقات“ کو بھی انہوں نے اپنے معمولات میں شامل کر رکھا تھا۔ ضلع بارہ بنکی کے ایک دیہات سے اٹھ کر اور ابتدائی تعلیم مدارس میں حاصل کر کے انہوں نے لکھنؤ شہر میں آ کر اپنی ایک شناخت بنائی۔ علمی، ادبی، اور دینی حلقوں میں رسائی حاصل کی۔ برائے نام اور ”برائے کار“ سیاست میں بھی پینگیں بڑھائیں۔ لیکن ذوق سے ہم آہنگ نہ ہونے کی وجہ سے سیاسی حلقہ میں ان کی کوئی شناخت نہیں قائم ہو سکی۔

وہ مسلمان تھے، اس لئے حج اور عمرے بھی کئے، بہت شاندار مسجد بھی تعمیر کرائی، اور دینی تعلیم کے لئے کچھ ادارے بھی قائم کئے۔ ہماری ظاہری نگاہوں نے یہ سب کچھ دیکھا — باقی رہا نیت و اخلاص کا معاملہ، تو وہ اللہ اور اس کے مسلمان بندہ کے درمیان کی چیز ہے۔ جس میں کسی کو دخل دینے کا حق حاصل

نہیں ہے — البتہ اس سلسلہ کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے جس سے ان کی علم دوستی اور فکر آخرت دونوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے؟

انتقال سے کم و بیش ۱۰-۸ برس قبل خواجہ صاحب زبردست قلبی حملہ کے شکار ہو کر لکھنؤ کے سول اسپتال میں داخل ہوئے۔ بہت شدید حملہ تھا مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی جان بچائی۔ طبیعت میں کچھ افاقہ ہونے کے بعد ایک روز میں عیادت کے لئے گیا، ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق ملنے ملاقات کرنے میں احتیاط برتی جا رہی تھی۔ مگر مجھے آسانی کے ساتھ ان کے پاس پہنچا دیا گیا۔ مجھے دیکھ کر ان کے آنسو بھر آئے۔ بیماری سے بہت متاثر اور فطری طور پر موت سے بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ میں نے دلا سے تسلی دیتے ہوئے ان کی ڈھارس بندھانے کے ساتھ ہی دنیا کی بے ثباتی کے سلسلہ میں بھی مختصر بات کی۔ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر بہت ہی درد بھرے انداز میں کہا، مولانا! موت سے تو چھٹکارا کسی کو نہیں مل سکتا ہے وہ تو آکر رہے گی۔ مگر دعا کر دو کہ اللہ میاں اس وقت صحت دے دیں۔ بہت سے اسکول کالج وغیرہ قائم کر لئے، لڑکیوں کا ایک دینی مدرسہ قائم کرنے کا پورا پروگرام بن گیا ہے، اللہ میاں اتنی مہلت دے دیں کہ ہم یہ کام صرف دین کے لئے کر لیں — اس کے بعد مرنا تو ہے ہی!

مجھے یاد ہے کہ انہوں نے مجھ سے دعا کرنے کی بات کچھ اس درد و سوز کے ساتھ کہی تھی کہ ان کے ساتھ ہی میری اور قریب ہی کرسی پر بیٹھی ان کی اہلیہ مرحومہ کی آنکھیں بھی بھیک گئی تھیں۔

خواجہ صاحب کی اس آرزو کو اللہ تعالیٰ نے پورا کیا، ان کو صحت بھی ہوئی اور انہوں نے پورے آن بان کے ساتھ لکھنؤ کے محلہ اکبر نگر میں لڑکیوں کا اپنا یہ مجوزہ اقامتی مدرسہ بھی قائم کر لیا۔

جن حالات میں جس انداز سے انہوں نے اس مدرسہ کے قیام کو اجر آخرت کی امید پر قائم کرنے کی بات کہی تھی اسے میں تو خیر ہی قرار دینے پر

مجبور ہوں؟۔

خواجہ یونس ہماری اس فانی دنیا سے رخصت ہو کر اپنے اس رب کریم کے حضور پہنچ گئے جس کی رحمت و پردہ پوشی کے بغیر کسی کا بیڑا پار نہیں لگ سکے گا۔ اور جس کا رحم و کرم اپنے شایان شان ہوگا۔ ہم گنہگار و خطا کار بندے تو اس اعتراف کے ساتھ اسی کی رحمت کے امیدوار ہیں کہ

مری زندگی، تری بندگی، مرا شیوہ عجز و نیاز ہے
میں گدائے عاجز و بے نوا، تو کریم و بندہ نواز ہے

خوشی کی بات یہ ہے کہ خواجہ صاحب نے اپنی زندگی ہی میں اپنے چاروں بیٹوں کو مختلف اداروں کی ذمہ داریاں سونپ کر اور اپنی نگرانی میں ان کو اداروں کے انتظام و انصرام سے وابستہ کر کے اس لائق بنا دیا تھا کہ وہ مرحوم کے تعلیمی مشن کو فروغ دینے کے اہل ہو چکے ہیں اور ہم امید کرتے ہیں کہ ان شاء اللہ وہ اپنے والد مرحوم کے تعلیمی مشن کو اور آگے بڑھائیں گے۔

وما زالنا علی اللہ بعزیزہ

***** ❁ *****

عبدالمنان قاسمی وہ ڈوب بھی گیا تو شفق چھوڑ جائے گا

۱۶ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ کے آغاز کے بعد اور ۱۲ جنوری ۲۰۲۰ء کے آغاز سے چند منٹ قبل یعنی ۱۱ جنوری ۲۰۲۰ء کو رات قریب ساڑھے گیارہ بجے کئی ماہ کی شدید تکالیف اور علالت کی صعوبتیں جھیلنے کے بعد روانہ ہسپتال میں میرے سب سے بڑے اور سعید و صالح بھانجے مولانا عبدالمنان قاسمی استاذ دارالعلوم فاروقیہ کوری نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اور اس کے دوسرے ہی دن ۱۳ جنوری ۲۰۲۰ء کو صبح نو بجے کے قریب میری حقیقی پھوپھی زاد بہن کے بنارس میں اس دنپائے فانی سے کوچ کر جانے کی اطلاع برادرِ م حافظ عبدالسمیع سلمہ نے دے کر غم فراق کو دو بالا کر دیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

دونوں عزیزوں کی اس مشترکہ محرومی اور ان شاء اللہ آخرت میں انعام و اکرام کے سبب کا سب سے پہلے ذکر کرنا ضروری ہے کہ حق تعالیٰ نے دونوں کو اس دنیا میں اولاد کی نعمت سے سرفراز نہیں کیا جس کی کسک لے کر وہ اس دنیا سے فانی ہو گئے و لدار الآخرة خیر و ابقى۔

عبدالمنان قاسمی (جن کو مرحوم لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آ رہا ہے اور جنہیں ہم سب اہل خانہ ان کے ظاہری حسن و جمال سے زیادہ اپنی چاہشیں و محبتیں

نچھاور کرنے کے لئے ”چاند“ کہہ کر پکارتے تھے) میری سب سے بڑی بہن کے پہلے بیٹے اور میرے والد ماجد حضرت مولانا عبدالحلیم فاروقی کی دوسری پیڑھی کے پہلے فرد تھے، اس لئے نانا نانی سے لے کر ہم تمام خردوں تک سب ہی کی آنکھوں کا تارا بن کر پلے بڑھے۔ حق تعالیٰ نے اپنے فضل سے ذہانت و سعادت کی نعمتیں عطا کی تھیں اس لئے بہت کم عمری میں حفظ قرآن مجید اور اس کے بعد تکمیل تجوید بروایت حفص کی سعادتیں حاصل کر لیں۔ پھر اس کے بعد دارالعلوم دیوبند کے نصاب کے مطابق جماعت فارسی سے مشکوٰۃ شریف وغیرہ کی جماعت تک پوری تعلیم دارالعلوم فاروقیہ کوری میں حاصل کرنے کے بعد ام المدارس دارالعلوم دیوبند سے ۱۹۷۸ء میں امتیازی نمبرات کے ساتھ سند فضیلت حاصل کی۔ اس دوران اور اس کے بعد الہ آباد عربی و فارسی بورڈ کی مولوی، منشی سے لے کر فاضل تک کی تمام سندیں بھی اعلیٰ نمبرات کے ساتھ حاصل کیں۔ دارالعلوم دیوبند سے تعلیم کی تکمیل کے بعد اپنے نانا کے ایماء سے ان کے قائم فرمودہ مدرسہ دارالعلوم فاروقیہ سے یہ حیثیت مدرس عربی وابستہ ہو گئے جس کا سلسلہ زندگی کی آخری سانس تک باقی رہا۔ وہ اپنے اساتذہ کے انتہائی مطیع و فرمان بردار اور اپنے طلبہ پر انتہائی شفیق و مہربان رہے۔ دارالعلوم فاروقیہ کے دور طالب علمی میں بہت اچھی تقریریں کرتے تھے جس سے یہ توقع تھی کہ اپنے نانا کی طرح وہ بھی اپنے وقت کے ایک کامیاب خطیب بنیں گے، لیکن دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد واپس آئے تو ذوق خطابت بالکل ختم ہو چکا تھا، البتہ لکھنے پڑھنے کے ذوق کی وجہ سے متعدد مضامین دیگر رسائل و اخبارات کے ساتھ ہی ”البدْر“ میں بھی شائع ہوئے جو جون ۱۹۷۷ء سے شائع ہونا شروع ہو چکا تھا اور دیوبند سے واپسی کے بعد ان کا نام بھی اس کی مجلس ادارت میں شامل کر لیا گیا تھا۔

مزاج میں شروع ہی سے ایک وارفتگی تھی، ان کا حلقہ احباب مختصر لیکن

”ان کا اپنا“ رہا جس میں علماء، قراء، اور شعراء و ادباء سب ہی شامل تھے لیکن بڑی تعداد شعراء کی تھی اور ملک گیر ہی نہیں عالم گیر شہرت کے حامل شعراء سے ان کے بہت ہی بے تکلفانہ مراسم تھے۔ اللہ جانے ان کی ذات و بات میں کیا ایسی کشش تھی کہ وسیم بریلوی، شمیم جے پوری، خمار بارہ بنکوی، راحت اندوری، کشفی لکھنوی، بشیر فاروقی، ساغر اعظمی اور اثر بہرائچی جیسے نامی گرامی شعراء کرام نہ صرف ان کا بے حد لحاظ کرتے تھے بلکہ ان کی ضد اور فرمائش پوری کرنے کے لئے اپنا کلام بھی ”البدر“ میں اشاعت کے لئے دیتے تھے جسے وہ بڑے اہتمام کے ساتھ اپنی خصوصی نگرانی میں شائع کراتے تھے۔ اپنی الگ ڈگر بنانے کا یہ مزاج ایسا تھا کہ مدرسہ میں بھی اپنے ہم رتبہ وہم عصروں، اپنے اساتذہ کرام و دیگر درجات عربی و فارسی کے اساتذہ سے زیادہ اٹھنا بیٹھنا درجات حفظ و تجوید کے اساتذہ خصوصاً حافظ محمد ہاشم مرحوم اور قاری محمد فضل الرحمن صاحب کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کے بعد ان کی ترجیح میں مدرسہ کے طلبہ ہوتے، ان سے گھل مل کر باتیں کرتے، اپنے لئے چائے منگواتے تو اکثر دو چار طالب علموں کے لئے چائے ضرور منگوا کر انہیں پلاتے بلکہ بسا اوقات تو طلبہ ان سے فرمائشیں کرتے جنہیں وہ خوش دلی کے ساتھ پوری کرتے۔ مدرسہ کے درجہ چہارم کے ملازم علی حسن مرحوم سے تو ایسی بے تکلفی تھی اور ان سے بسا اوقات ایسی چھینا جھپٹی کرتے کہ کئی مرتبہ مجھے ٹوکنا بھی پڑا۔ خاموشی کے ساتھ دوسروں کا تعاون کرتے، طلبہ و اساتذہ خصوصاً درجات پرائمری کے اساتذہ اور کم رتبہ ملازمین کو بوقت ضرورت بڑی بڑی رقمیں قرض دے دیتے، اور پھر ان کی واپسی کا کبھی تقاضا نہیں کرتے، متعدد مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ طالب علم ان کی رقم لے کر مدرسہ سے چلے گئے اور ان کی رقمیں ڈوب گئیں مگر انہوں نے نہ اس کا کسی سے شکوہ کیا نہ ہی اپنی روش میں کوئی تبدیلی کی بلکہ اگر کوئی طالب علم کبھی پلٹ کر برسوں کے بعد ملنے ملانے کے لئے مدرسہ آیا تو ملاقات کے باوجود اپنی پچھلی رقم کا اس سے

کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے یہ بھی دیکھا کہ آنے والے نے از خود اصرار کر کے اور یاد دہانی کر کے اپنے قرض کی رقم واپس کرنا چاہی تو بہت ہی رد و کد اور اصرار کے بعد ہی انہوں نے اسے قبول کیا ورنہ بس یہی ایک بات کہ جاؤ جاؤ بس جو ہونا تھا ہو گیا، میں نے معاف کیا۔

مزاج میں سادگی اور عاجزی و فروتنی ایسی کہ مدرسہ اور مدرسہ کے باہر ہونے والے کسی بھی پروگرام میں انہیں اسٹیج پر بیٹھے دیکھنا مجھے یاد نہیں ہے۔ مشاعروں میں شرکت کے بہت شوقین تھے اور بسا اوقات نامی گرامی شعراء کرام انہیں اپنے ساتھ اسٹیج پر لے جانے کا اصرار کرتے، مگر اسے کبھی منظور نہیں کرتے تھے۔ قرآن مجید کے بہت ہی عمدہ حافظ تھے، چلتے پھرتے کثرت کے ساتھ تلاوت قرآن کرتے رہتے۔ مدرسہ میں تقسیم اسباق کے وقت ترجمہ و تفسیر قرآن کا کوئی نہ کوئی سبق مطالبہ کر کے لیتے اور پھر کافی محنت و مطالعہ کے بعد سبق پڑھاتے۔ دارالعلوم دیوبند کے اپنے اساتذہ میں حضرت مولانا انظر شاہ کشمیریؒ سے خصوصی عقیدت و محبت تھی، ان کا ذکر بڑی محبت کے ساتھ بار بار کرتے تھے اور ان کی شان میں ہونے والی کسی ادنیٰ بے احترامی کو بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ دارالعلوم فاروقیہ میں تدریس کے ابتدائی دور میں ایک مرتبہ شاہ صاحب مرحوم کی نقل میں ایک لیٹر پیڈ چھپوایا تھا جس میں اپنے کو ”شیخ التفسیر“ لکھوایا تھا۔ زندگی کے آخری چند برسوں میں دماغی امراض اور دوروں کی شکایت ہونے سے معذوری بڑھتی گئی۔ پہلی سے چہل پہل اور سرگرمیاں دھیرے دھیرے کم ہوتی گئیں۔ کوئی موقع ہاتھ آتے ہی اپنی بارہ بنکی والی خالہ (جنہیں وہ اکثر اپنی اماں کہتے تھے) کے پاس جانا بھی کم سے کم تر ہو گیا۔ اکثر خاموش رہتے اور بس اپنے کام سے کام رکھتے۔ خصوصی رفقاء درس میں مولانا محمد شفیع قاسمی صدر مدرس دارالعلوم فاروقیہ، مولانا محمد اکرم قاسمی منڈولی، مولانا محمد عرفان قاسمی سینا پوری، مولانا محمود دریا بادی (آخر الذکر دونوں حضرات ممبئی

میں ہیں) اور ان کے علاوہ احباب میں قاری عتیق الرحمن صاحب سابق استاذ مدرسہ تجوید الفرقان لکھنؤ و مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، فرحت حسین جعفری صاحب تاجر عطر لکھنؤ، قاری صبغت اللہ صاحب صدر شعبہ تجوید مدرسہ تجوید الفرقان لکھنؤ تھے۔ جن سے کبھی بہت گہرا اور بے تکلفانہ ربط و رشتہ تھا، لیکن جوں جوں معذوری بڑھتی گئی ان حضرات سے بھی ملنے کا پہلا سا انداز باقی نہیں رہ گیا تھا۔

اگست ۲۰۱۹ء کے اواخر میں برین ہیمبرج کا زبردست اٹیک ہوا، پہلے فہمینہ ہسپتال، پھر چرک ہاسپٹل اور لوہیا ہسپتال کے بعد آخر میں روانا ہسپتال میں داخل کئے گئے۔ قلیل وقفہ کے لئے کچھ سدھار ہوا، ہوش میں آئے اور بات چیت بھی کرتے رہے، لیکن معمول کے مطابق نہ منہ سے غذا ہو سکی نہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکے جس کی وجہ سے کمزوری، لاغری کی حد تک بڑھ گئی تھی۔ بالآخر ۱۶ جمادی الاولیٰ ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۱ جنوری ۲۰۲۰ء کو رات قریباً ساڑھے گیارہ بجے وقت موعود آگیا اور وہ ہماری اس فانی دنیا سے اپنی بیوہ ماں اور بہت سے بڑوں کی موجودگی میں اپنے رب کریم کے حضور کوچ کر گئے۔

فيا ايته النفس المطمئنة ارجعي الي ربك راضية مرضية فادخلي في عبادي وادخلي جنتي۔

رب کریم نے اپنی امانت واپس لے لی اس میں کسی کو نہ واپس دینا کا حق ہے نہ ہی شکوہ شکایت کا۔ اطمینان کی بات یہ ہے کہ مرحوم سبک بار جیئے اور سبک بار ہی اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ اسباب کے درجہ میں دوا علاج اور تیمارداری میں کوئی کسر نہیں رہی۔

حق تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ چلین عطا فرما کر اپنے قرب خاص سے نوازے۔ ان کی حسنات کو قبول فرمائے اور ان کی خطاؤں کو معاف فرمائے۔ ان کی ان ضعیف العمر اور بیوہ ماں کو جنہیں دوسری مرتبہ ایسے حادثہ سے دوچار ہونا پڑا ہے اور ان بیوہ ہو جانے والی زوجہ کو جس کے پاس ان کی یادوں سے

دامن چھڑانے کے لئے اپنی کوکھ کی کسی اولاد کا بھی سہارا نہیں ہے، اور پھر جملہ پسماندگان اور بھرے پرے کنبہ کو صبر جمیل کی توفیق ارزانی فرمائے۔ (آمین)۔

دل میں یاد غم بے کراں رہ گئی
جانے والا گیا داستاں رہ گئی



حسین امین سنجیدہ صحافی، عظیم انسان

بعض لوگ بہت خاص ہوتے ہوئے بھی اپنی اختیاری سادگی اور عاجزی و فروتنی کے ذریعے اپنے کو عام رکھ کر ہی مگن رہتے ہیں۔ وہ ”چہیتے“ ہوتے ہیں، لیکن انہیں چاہئے والے بھی نہ کھل کر اس کا اظہار کر پاتے ہیں، نہ ہی ”چہیتے“ کو اپنے کو کسی کے لئے خاص یا چہیتے ہونے کا احساس ہو پاتا ہے۔ بات ایک وضعدار، منکسر المزاج، اور تبسم برب صحافی حسین امین صاحب مرحوم کی ہے، جن کے دل سے اتنا قریب ہونے کا احساس خود راہم الحروف کو بھی ان کے اس دنیائے فانی سے کوچ کر جانے کے بعد ہی صحیح طور پر ہوسکا؟

حسین امین صاحب نے جب ہماری اس فانی دنیا سے عالم باقی کی طرف کوچ کیا، تو ان کا شمار اردو کی صف اول کے صحافیوں میں ہوتا تھا۔ یوں تو صحافت انہیں وراثت میں ملی تھی کہ ان کے والد ماجد امین سلونوی صاحب مرحوم نہ صرف ایک پختہ کار صحافی و قلم کار تھے، بلکہ انہوں نے اختراعی طور پر اپنے محدود وسائل کے ساتھ اردو کی ایک نیوز ایجنسی بہ نام ”انڈی پیڈنٹ نیوز سروس“ بھی قائم کی تھی، اور اس کے مخفف نام ”الف، نون، س“ سے وہ مختلف اخباری مواد روزنامہ ”قومی آواز“ لکھنؤ و دیگر اخبارات کو دیا کرتے تھے۔ اردو کے معروف و صاحب طرز مزاح نگار شوکت تھانوی (جو امین سلونوی صاحب کے حلقہ احباب

میں شامل تھے) کے بقول امین صاحب نے اپنی صحافت کے ”عنوان شباب“ میں ایک رسالہ ”ترچھی نظر“ کے نام سے بھی نکالنا شروع کیا تھا۔ ان کے حلقہ احباب میں نسیم انہونوی اور عمر انصاری جیسے لوگ بھی شامل تھے۔

حسین امین مرحوم نے اسی ”صحافت کی کہکشاں“ میں شعور کی آنکھ کھولی تو انہیں فطری طور پر صحافی تو ہونا ہی چاہئے تھا۔ وہ اپنے والد کی وراثت یا وساطت سے ”قومی آواز“ جیسے اردو اخبار سے وابستہ ہوئے تو وہاں کے ماحول اور تربیت نے انہیں بتدریج صف اول کا صحافی بنادیا۔ کیوں کہ اردو دنیا کی صحافت میں یہ بات مسلم ہے کہ ”قومی آواز“ اردو کا ایک اخبار ہی نہیں، بلکہ اردو صحافت کا ایک ایسا ٹریننگ اسکول تھا کہ اس سے کچھ عرصہ تک وابستہ رہ جانے والا بھی ایک ”منفرد و معتبر صحافی“ بن جایا کرتا تھا، جب کہ حسین امین صاحب کی تو ”قومی آواز“ سے وابستگی اخبار کی آخری سانس تک رہی؟

حسین امین صاحب مرحوم سے باقاعدہ تعارف کے ساتھ ملنے ملانے کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب نہ صرف وہ بھرپور جوان تھے بلکہ ان کا اخبار ”قومی آواز“ بھی ”جوان رعنا“ تھا۔ اس کے بانی مدیر حیات اللہ انصاری پوری طرح کار بند تھے، اور ان کے معاونین میں عشرت علی صدیقی، مسیح الحسن رضوی، عبدالمجیب سہالوی، احمد جمال پاشا، اور چودھری نصیر وغیرہ جیسے منجھے ہوئے اور پختہ کار صحافی تھے۔ ان حضرات کے مقابلہ میں حسین امین مرحوم اس وقت بہت کم عمر، نا تجربہ کار اور جونیئر تھے۔ ان کا تعلق اخبار کے ”ڈسک ورک“ سے نہیں تھا، بلکہ وہ ایک رپورٹر تھے۔ جن کی دفتر میں ڈیوٹی نہیں ہوتی تھی۔ البتہ وہ اپنی جمع کی ہوئی خبریں لے کر دفتر جاتے تو کافی کافی دیر تک وہاں ٹھہرتے۔ اس دوران کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ میں کوئی خبر لے کر گیا، اور میری ”خوش قسمتی“ سے حسین امین صاحب مجھے مل گئے تو ان کے ذریعہ خبر کی اشاعت یقینی ہو جایا کرتی تھی۔ ویسے اس کام میں احمد ابراہیم علوی صاحب اور شعبہ کتابت سے وابستہ سلیم عمر صاحب مرحوم سے بھی مجھے تعاون مل جایا کرتا تھا۔ بات دراصل یہ

تھی کہ اس وقت ”قومی آواز“ کا اپنا ایک ایسا بلند معیار تھا کہ اس میں خبروں کی اشاعت آسان نہیں تھی، پھر خبروں کے انتخاب اور ان کی چائے اشاعت کا بھی اپنا ایک معیار تھا۔ میری اپنی ہر خبر کے لئے یہ خواہش ہوتی کہ اس کی اشاعت ”مختصر مقامی خبریں“ والے ”بھرتی کے کالم“ میں نہ ہو کر مستقل سرخی کے ساتھ ہو۔ اور اس وقت کے ”قومی آواز“ میں یہ التزام و اہتمام آسان نہیں تھا، اور اسے آسان کرنے کا کام اکثر حسین امین انجام دے کر مجھے خوش کر دیا کرتے تھے۔

حسین امین مرحوم صحافت کے اس عہد سے وابستہ تھے جب صحافت سے وابستگی ”شرافت“ سے وابستگی کی ضمانت ہوا کرتی تھی، اور عموماً شاعر کی طرح صحافی بھی سماج کا ایک معزز فرد تو ہوتا تھا لیکن ”متمول“ نہیں۔ دور حاضر کی طرح نہ صحافی کروڑوں کا بیلنس رکھتا تھا، نہ ہی اسے رہائش کے لئے شاندار بنگلہ اور سواری کے لئے لگژری کاریں میسر ہوتی تھیں۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ اس کے قلم کے دھار سے ”ایوان اقتدار“ میں ہر وقت زلزلہ کی سی کیفیت طاری رہتی تھی۔ اچھے اچھوں کو خاطر میں نہ لانے والی پولیس کے ”ہاتھ کاڈنڈا“ صحافی کو دیکھتے ہی ہاتھ سے چھوٹ کر زمین بوس ہو جایا کرتا تھا۔ غالباً ایسے ہی صحافی وغیرہ صحافی برادری کے قلم کاروں کو اپنا خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے پنڈت آنند نرائن ملّا نے اپنا یہ ”متنازعہ شعر“ کہا تھا کہ

خون شہید سے بھی ہے قیمت میں کچھ سوا
فن کار کے قلم کی سیاہی کی ایک بوند

حسین امین مرحوم کی صحافتی تربیت اردو کے قد آور صحافی، بلکہ ”صحافتی اسکول“ حیات اللہ انصاری مرحوم کے زیر سایہ ہوئی تھی جسے اپنے گھر سے اپنے دفتر آتے جاتے خود راقم الحروف نے لگژری کار سے نہیں، بلکہ سائیکل رکشہ کی سواری پر دیکھا ہے۔ اور یہ منظر اس وقت بھی نگاہوں کے سامنے آیا جب وہ ملک کی آزادی سے پہلے کی کانگریس پارٹی سے اٹوٹ وابستگی، اور آزاد

ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو سے لے کر ”آئرن لیڈی“ کہلائی جانے والی وزیر اعظم اندرا گاندھی تک براہ راست و ”بالحاظ رشتوں“ کے ذریعہ ملک کے ایوان بالا (راجیہ سبھا) کے باوقار رکن تھے۔ حسین امین کو بھی اردو صحافت کے ”نیر تاباں“ بن جانے کے باوجود نہ کبھی ”شاندار بنگلہ“ میں رہائش نصیب ہوئی، نہ ہی سواری کے لئے لگژری کار۔ اور انہوں نے اپنی حیات مستعار کی آخری سانس بھی اسی پتلی سی گلی کے بالائی منزل پر واقع اس چھوٹے سے کمرہ میں لی جہاں تک پہنچتے ہوئے ان کی سانسوں کا توازن بگڑ جایا کرتا تھا، اور بسا اوقات ”دم لینے کے لئے“ انہیں درمیان کے کسی زینہ پر پٹھرنا پڑ جاتا تھا۔ ان کی رہائش گاہ کے یہ ایسے ”کھڑے زینے“ تھے کہ جب راقم الحروف اچانک ان کی وفات کی خبر سے بے چین ہو کر ان کے آخری دیدار کے لئے اس ”پل صراط نما زینوں“ کو عبور کر رہا تھا تو میری ”قابل رحم حالت“ دیکھ کر چڑھتے اور پھر اترتے ہوئے دیکھنے والے بے ساختہ سہارا دینے پر مجبور سے ہو گئے تھے۔ مگر اللہ رے حسین امین مرحوم کی شان بے نیازی، اور ”فقر پر فخر“ کے اس انداز کے ساتھ اپنے فرض کی ادائیگی میں انہماک کہ کسی نے کبھی بھی انہیں منہ بسور کر شکوہ کرتے نہیں پایا، بلکہ پوری فرحت و انبساط کے ساتھ وہ دریافت حال کرنے والوں سے مسکرا مسکرا کر اپنی اسی رہائش کا پتہ بتا کر انہیں بھی ”دعوت امتحان“ دیا کرتے تھے۔

”قومی آواز“ بند ہونے کے بعد غالباً حسین امین صاحب نے کسی اخبار سے ملازمت کا رشتہ نہیں قائم کیا۔ وہ لکھنؤ سے شائع ہونے والے روزنامہ ”صحافت“ کے لئے لکھتے تھے لیکن میں اس اخبار سے ان کے تعلق کی نوعیت سے واقف نہیں ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس اصول پر کار بند تھے کہ ”گھوڑے سے اتر کر گدھے کی سواری نہیں کی جاتی“۔ ”قومی آواز“ ان کی شناخت بھی تھا اور اسی نے انہیں مکمل صحافی بھی بنایا تھا۔ ”قومی آواز“ میں انہوں نے ملک کے کئی اہم اور سلگتے ہوئے مسائل کی ایسی سنجیدہ، غیر جذباتی، اور مبنی

برصداقت و انصاف رپورٹنگ کی تھی کہ ان کی تیار کردہ خبروں کو جہاں ملک و بیرون ملک کے متعدد بڑے اور اہم اردو اخباروں نے من و عن شائع کیا، وہیں انگریزی، ہندی اور دیگر زبانوں کے اخبارات نے ان کی خبروں پر ”اعتماد“ کرتے ہوئے ان کا ترجمہ کروا کر اپنے اخباروں کی زینت بنایا۔ شاہ بانو کے مشہور مقدمہ اور اس پر اٹھنے والے طوفان بلاخیز سے لے کر مسلم ”مطلقہ خواتین قانون“ بننے تک کی خبروں کی جیسی متوازن و دیانت دارانہ رپورٹنگ انہوں نے کی، اسی طرح ”بابری مسجد“ کو لے کر اٹھنے والی ”رام جنم بھومی تحریک“ اور اس سے وابستہ مقدمات کی مرحلہ وار اور تفصیلی رپورٹنگ کے لئے بھی حسین امین کی منصفانہ و دیانت دارانہ صحافت کو یاد کیا جائے گا۔

حسین امین ایک بااخلاق، بامروت، اور وضع دار انسان تھے۔ وہ اپنے تمام بڑوں خصوصاً علمائے کرام سے بہت ہی احترام اور نیازمندی کے ساتھ ملتے، علمائے کرام بھی ان کے اخلاص و اخلاق کے بہت قدردان رہے۔ حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی وجہ سے ندوہ اور حلقہ ندوہ میں ان کی بہت پذیرائی تھی۔ ان ہی کی تحریک و مشورہ پر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ”شعبہ صحافت“ کا قیام عمل میں آیا، اور حسین امین صاحب اس شعبہ کے طلبہ کو ”صحافی گر“ سکھانے کے لئے باقاعدہ پابندی کے ساتھ جاتے اور طلبہ کو اپنے ”صحافتی تجربات“ تقسیم کرتے رہے۔

حسین امین ہماری اس فانی دنیا سے جب رخصت ہوئے تو ان کا نام ”دنیاۓ صحافت“ میں سند و اعتبار کا مقام حاصل کر چکا تھا۔ وہ اردو کے ان چند گنے چنے صحافیوں میں سے تھے جن کے ”حلقہ یاراں“ میں اردو ہی نہیں بلکہ پرنٹ میڈیا سے لے کر الیکٹرانک میڈیا تک دیگر زبانوں کے متعدد قدآور اور اہم صحافی بھی شامل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی وفات پر جہاں اردو کے صحافی رنجیدہ و مغموم ہوئے وہیں ہندی و انگریزی کے صحافیوں نے بھی ان جیسے مخلص و بے باک صحافی کی موت کو دنیاۓ صحافت کے لئے ایک خلا قرار دیا۔

حسین امین کی صحافت اور صحافتی زندگی کی سب سے اہم اور لائق تقلید خوبی ان کی دیانتداری، بے غرضی و بے نیازی تھی۔ ان کی سادگی، وضعداری اور بے نفسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں بہلا اور پھسلا کر یا اپنے کو ”قابل رحم“ بنا کر تو کام لیا جاسکتا تھا، لیکن انہیں خرید نہیں جاسکتا تھا۔ وہ ایک انسان تھے، ایک مسلمان تھے، اپنی مذہبی اور مسلکی ترجیحات کا پاس و لحاظ رکھنے والے تھے۔ اسی طرح ان کے اپنے سیاسی اور ملی رجحانات بھی تھے اور ملی تنظیموں و تحریکوں سے ان کی باقاعدہ وابستگی بھی رہی۔ لیکن اصول، انصاف، اور احترام کے دامن ان کے ہاتھوں سے کبھی نہیں چھوٹے۔ انہوں نے اپنے قلم اور صحافت سے اپنی پسندیدہ شخصیات، جماعتوں، اور تحریکوں و تنظیموں کی مدح سرائی تو کی، لیکن پکڑیاں اچھالنے، دل آزاری کرنے، جذبات کو مجروح کرنے، اور اداروں، جماعتوں، تنظیموں و تحریکوں کی ”حیثیت عرفی“ کو پامال کرنے کا جرم انہوں نے کبھی نہیں کیا، وہ اپنا نقطہ نظر پیش کرتے ہوئے موافقت بھی کرتے اور مخالفت بھی، لیکن دونوں کو پیش کرتے ہوئے اعتدال و توازن کو پورے لحاظ کے ساتھ برقرار رکھتے، موافقت کے ڈانڈے خوشامد اور چالپوسی سے ملادینے اور مخالفت کے ڈانڈے بغض و کینہ اور یا وہ گوئی سے ملادینے کو وہ کبھی گوارہ نہیں کرتے تھے۔ انہیں اور ان کے قلم و صحافت کو سمجھنے کے لئے ان کی کتاب زندگی کے ان دو واقعات کو بہ طور مثال پیش کیا جاسکتا ہے:

(۱) ان کی صحافتی زندگی کی سب سے زیادہ وابستگی پنڈت جواہر لال نہرو اور حیات اللہ انصاری کے جاری کردہ اور ان کی ”کانگریس پارٹی“ کے ترجمان اخبار ”قومی آواز“ سے رہی، پھر وہ ذاتی طور پر بھی اپنے گھریلو ماحول کے زیر اثر سیاسی رجحان کے لحاظ سے ”کانگریسی“ تھے۔ انہوں نے ”قومی آواز“ میں بھی، اور ”قومی آواز“ کے بعد بھی اپنے لیڈروں اور اپنی پارٹی کی موقع بہ موقع خوب خوب مدح و توصیف کی۔ اور یہ

کہہ دینے میں بھی کچھ حرج نہیں کہ ”ان کی سیاہی“ کو دھونے اور لپٹا پونتی کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی — اسی کے ساتھ ان کے مخالفین کا ”واجبی تعاقب“ کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ تاہم ”ذی مرتبت و باوقار مخالف لیڈروں اور ان کی پارٹیوں کے سلسلہ میں کوئی ایسا ”مبتذل و سوقيانہ لفظ“ استعمال نہیں کیا جس پر انہیں شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا ہو؟

(۲) وہ مسلمانان ہند کی سب سے قدیم و باوقار تنظیم ”جمعیتہ علمائے ہند“ سے ذہنی و فکری اور عملی طور پر ہمیشہ وابستہ رہے۔ بد قسمتی سے چند برس پہلے اس تنظیم پر ایسا وقت آیا کہ وہ دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئی، اور دونوں ہی دھڑے اپنے کو اصل ”جمعیتہ علماء“ گرداننے لگے۔ مرکز سے لے کر صوبوں، اضلاع، اور قصبہات تک دونوں کی الگ الگ یونٹیں، اور دفاتر بھی قائم ہو گئے۔

فطری طور پر اس تقسیم کا اثر اوپر سے لے کر نیچے تک تنظیم کے تمام کارکنوں اور باقاعدہ وابستگان پر پڑا۔ اور انہیں اپنی ”جماعتی وفاداریاں“ کسی ایک دھڑے کی طرف منتقل کرنا پڑیں۔ اس ”آپادھانی“ میں یہ بھی ہوا کہ کچھ کیسے کیسے، ایسے ویسے ہوئے — تو کچھ ایسے ویسے، کیسے کیسے ہو گئے؟۔

تقسیم کے ابتدائی دور میں وہ بھی ہو کر رہا جو کسی بڑے اور تناور درخت کے گرنے سے زمین اور اہل زمین کے لئے ہوا کرتا ہے کہ کسی کا ”بھلا“ ہوتا ہے تو کسی کا نقصان! حسین امین صاحب جو اپنی ذات ہی سے نہیں، موروثی طور پر ”جمعیتہ“ سے وابستہ تھے۔ تقسیم کے اس عمل سے کیوں کر محفوظ رہ سکتے تھے؟ چنانچہ وہ ایک دھڑے سے جڑ کر ”ضلع جمعیتہ علماء لکھنؤ“ کے جنرل سکریٹری کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ اور اپنی زندگی کی آخری سانس تک اپنے عہدہ، اور اپنی تنظیم کے وقار کی حفاظت کرتے ہوئے پوری سرگرمی کے ساتھ اپنی زبان،

اپنے قلم، اور اپنے حلقہ احباب کے ذریعہ تنظیم کے اغراض و مقاصد کو پورا کرنے کی جدوجہد کرتے رہے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہاں بھی مرحوم حسین امین نے اپنی زبان اور اپنے قلم کی حفاظت کا ”بھرم“ قائم رکھا۔ بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ایک ذمہ دارانہ عہدہ پر فائز رہتے ہوئے انہوں نے ہر قدم پھونک پھونک کر رکھا۔

”جمعیتہ علماء“ بنیادی طور پر مسلمانوں کی ایک ایسی تنظیم ہے جس کا قیام علمائے کرام کے ذریعہ عمل میں آیا، اور آج تک اس کے عہدیداروں اور ذمہ داروں میں بڑی تعداد علماء کرام اور ان سے وابستہ دینی حلقوں کے مسلمانوں ہی کی رہی — حسین امین صاحب کو اس بات کا پوری طرح لحاظ رہا کہ ان کے ”مخالف دھڑے“ میں بھی بڑی تعداد میں معزز و باوقار علماء کرام اور ان کے وابستگان ہی کی ہے۔ اور اسی ”پاس و لحاظ“ کا یہ اثر رہا کہ انہوں نے اختلاف رائے کا اظہار کرتے ہوئے بھی احتیاط کا دامن کبھی نہیں چھوڑا — بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ علم اور علماء کے احترام کے معاملہ میں تو وہ کسی ”مسلکی سرحد“ کو بھی روا نہیں رکھتے تھے؟۔

حسین امین مرحوم کی یہی وہ خوبیاں تھیں جنہوں نے ان کو ایک عظیم صحافی ہی نہیں، ایک ”عظیم انسان“ بنادیا تھا — اسی لئے ان کی جدائی کا صدمہ ”ہر انسان“ کو ہوا، اور یہ صدمہ دور تک اور دیر تک رہے گا۔ مگر اس قانون اور قدرت کو تسلیم کرنے پر سب ہی مجبور ہیں کہ —

بھروسہ مت کرو سانسوں کی ڈوری ٹوٹ جاتی ہے
چھتیں محفوظ رہتی ہیں حویلی ٹوٹ جاتی ہے



حافظ ہاشم مرحوم

ہمارے مدرسہ (دارالعلوم فاروقیہ کوری) کے ہر دل عزیز استاذ جناب حافظ محمد ہاشم صاحب نے ۹ رمضان ۱۴۲۷ھ کو صرف دس روز کے موت وزیست کی کشمکش سے نجات پا کر عالم فانی سے عالم باقی کی طرف کوچ کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حافظ محمد ہاشم مرحوم ملیح آباد لکھنؤ کے قریب ایک گاؤں ہمارا پور کے رہنے والے تھے۔ بہت کم سنی میں مدرسہ میں داخلہ لیا اور یہیں رہ کر حفظ کلام اللہ کی تکمیل کی۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد اسی مدرسہ میں تدریس کے رشتہ سے منسلک ہو گئے اور یہاں کے ایک درجہ حفظ کے استاذ رہے۔ اپنی سعادت مندی، مرنجاں مرنجی، خوش اخلاقی اور منکسر مزاجی کی وجہ سے نہ صرف مدرسہ کے طلبہ و اساتذہ میں بلکہ کوری اور قرب وجوار میں بھی انہوں نے اپنی ایک شناخت بنالی تھی۔ ۳۰ شعبان کو عصر و مغرب کے درمیان اسی مسجد میں جہاں کے وہ امام بھی تھے اور کئی برسوں سے تراویح میں قرآن مجید سنارہے تھے، اچانک چکرا کر گر گئے، نماز کے بعد انہیں اسپتال پہنچایا گیا تو معلوم ہوا کہ ”برین ہیمرج“ ہو گیا ہے۔ ابتداءً کئی دنوں ہوش و حواس کے ساتھ بات کرتے تھے۔ پھر غشی (کوما) طاری ہو گئی اور دوا و علاج کی بہترین کوششوں کے باوجود فیصلہ خداوندی غالب آکر رہا۔ ۹ رمضان کو رات ۱۲ بجے کے بعد زندگی پر موت نے فتح

حاصل کر لی۔

عمر ابھی چالیس برس سے کم تھی، جوان العمر بیوہ کے علاوہ ۴ بیٹے اور ایک بیٹی پسماندگان میں چھوڑے، بچے ابھی سب ہی کم سن اور نابالغ ہیں۔ حافظ صاحب مرحوم کی اچانک جدائی نہ صرف ان کے ورثاء و اقرباء کے لئے بلکہ ہم تمام متعلقین کے لئے باعث الم بھی ہے اور ذریعہ عبرت بھی۔

درج بالا چند سطریں حافظ محمد ہاشم مرحوم کی وفات کے موقع پر ”تعزیتی شذرہ“ کے طور پر ماہنامہ ”البدر“ میں شائع کی گئی تھیں۔ اور اس کی بنیاد بھی حافظ صاحب مرحوم کی اس ادارہ سے نسبت تھی جس سے میرا بھی ایک ذمہ داری حیثیت سے رشتہ تھا۔

بات پرانی ہو گئی۔ دنیا کے دستور کے مطابق حافظ صاحب مرحوم کے گھر کی گاڑی بھی چلتی رہی، اور اب ماشاء اللہ ان کے بچے بھی جوان ہو گئے، مدرسہ میں بھی ان کی جگہ پر دوسرے استاذ کا تقرر ہو گیا، اور مدرسہ کا نظام بھی بفضلہ تعالیٰ چل رہا ہے۔ مگر حافظ ہاشم برابر یاد آتے ہیں۔ اپنی بے لوث محبت کی وجہ سے، اپنے مدرسہ کے ساتھ مخلصانہ رشتہ کی وجہ سے، اور اپنی منفرد اداؤں کی وجہ سے بھی؟۔

حافظ ہاشم مرحوم میرے شاگرد نہیں تھے لیکن ان کی طالب علمی کے دور میں میں ہی مدرسہ کا صدر مدرس بھی تھا اور عملی طور پر مہتمم بھی، اس لئے مجھ سے ان کا سابقہ پڑتا ہی رہتا تھا۔ طلبہ و اساتذہ کے درمیان خلوص و محبت کے رشتوں کا دور دورہ تھا۔ طالب علمی کا دور ختم ہونے کے کچھ عرصہ بعد ان کا مدرسہ میں بہ حیثیت استاذ تقرر ہو گیا تھا۔ اس طرح رشتہ کا تسلسل باقی رہا۔ میرے چھوٹے بھائی حافظ عبدالکریم تو ان کے درجہ کے ساتھی ہونے کی وجہ سے بے تکلف دوست تھے لیکن اپنی طبعی سعادت کی وجہ سے مجھ سے ”ادب و احترام“ کا معاملہ رکھتے تھے۔ میرے بچوں سے بڑے بھائی جیسا معاملہ رکھتے تھے۔ ان کے

انتقال کے بعد میرے بیٹے مفتی حارث عبدالرحیم سلمہ نے مجھے بتایا کہ حافظ جی نے کئی مرتبہ مجھ سے کہا کہ تم باہر رہ کر تعلیم حاصل کر رہے ہو، تم میرے چھوٹے بھائی ہو، تمہارے والد صاحب میرے لئے بھی باپ کی طرح ہیں۔ ان کے اوپر بڑی ذمہ داریاں ہیں۔ ماشاء اللہ تم سب بھائی بہنوں کی پڑھائی لکھائی وغیرہ کا لمبا خرچ ہے۔ اس لئے تمہیں کوئی اضافی خرچ کی ضرورت ہوا کرے تو خاموشی کے ساتھ مجھ سے لے لیا کرو، یہ میرا تمہارا معاملہ ہوگا۔ اس کی اپنے والد صاحب یا کسی بھی دوسرے کو اطلاع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح کبھی کبھی اپنے گھر سے میرے لئے کوئی پسندیدہ چیز خاص طور پر دیہاتوں والی بیسن کی روٹی بنوا کر لاتے تھے اور میرے بھائی حافظ عبدالکریم کو واسطہ بنا کر مجھے کھلاتے اور خوش ہوتے۔ مزاج میں سخاوت تھی، اس لئے اپنے مدرسہ کے ساتھیوں اور درجہ کے طلبہ کو بھی کھلاتے پلاتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی ساتھی کی فرمائش پر چائے منگوانے کے لئے جیب سے روپے نکالے تو وہ بالکل مڑے اور کاغذ کی گولیوں کے شکل میں تھے۔ میری نظر پڑی تو میں نے حیرت کے ساتھ پوچھا کہ روپے رکھنے کا یہ کون سا انداز ہے؟ یہ تو نعمت کی ناقدری ہے؟ برجستہ بولے کہ صدر صاحب! یہ روپیہ بہت بے وفا چیز ہے، کسی کے پاس ٹکتا نہیں ہے، اسے کتنے ہی ادب و احترام کے ساتھ تہہ کر کے رکھا جائے مگر یہ ٹکتا نہیں ہے۔ تو پھر ہم ان ”بے وفا“ کا احترام کیوں کریں؟۔

اسی طرح کی ایک دلچسپ بات انہوں نے اس وقت کہی جب ان کے یہاں چار بیٹوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے بیٹی دی۔ بیٹی پا کر وہ خوشی سے پھولے نہیں سارے تھے، مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے بیٹی کے لئے کافی سامان کی خریداری کی ہے۔ اس میں ایک قیمتی جھولا بھی شامل ہے۔ میں نے ان کی خوشی میں شرکت کرتے ہوئے کہا، سنا ہے کہ آپ نے بیٹی کے لئے جھولا بھی خریدا ہے؟ جواب میں مسکراتے ہوئے بولے، ہاں آپ لوگوں کی دعاؤں سے اللہ

نے بیٹی دی ہے تو اس کے لئے جھولا بھی خریدا ہے۔ میں نے کہا کہ اگر بیٹی نہ ہوتی تو؟ برجستہ بولے، کہ پھر جھولا رکھا ہے۔ اسی میں رسی باندھ کر جھولا بنادیتا۔ یہی سب لڑکوں کے لئے کیا ہے۔ ہم دیہات والے بچوں کے لئے ایسا ہی جھولا بنوا لیتے ہیں۔ یہ تو بیٹی ہے اس لئے اس کے لئے یہ اہتمام کیا ہے؟۔

میرے ساتھ انہوں نے کئی سفر بھی کئے اور بہت اچھے رفیق سفر ثابت ہوئے۔ ان کی خواہش تو یہ ہوتی کہ ہر سفر میں ان کو ہی رفیق سفر بنا کر لے جاؤں، اس سلسلہ میں ان کی یہاں تک پیشکش ہوتی کہ اپنا کرایہ میں خود دوں گا، بس آپ ساتھ چلنے کی اجازت دے دیا کیجئے۔ لیکن یہ ممکن نہیں تھا، کیوں کہ مدرسہ میں درجہ حفظ کے استاذ ہونے کی وجہ سے مجھے ان کی ذمہ داریوں کا بھی لحاظ کرنا پڑتا تھا۔ ان کی زندگی کا میرے ساتھ آخری سفر بلگرام ضلع ہردوئی کے ایک دینی جلسہ میں شرکت کے لئے ہوا تھا، جو ان کے لئے بھی اور خود میرے لئے بھی ایک یادگاری سفر ثابت ہوا۔ کیوں کہ اس سفر میں ہم لوگوں کی محی السنۃ حضرت مولانا ابرار الحق صاحب سے آخری ملاقات حضرت کی وفات سے صرف پندرہ دن پہلے ہوئی تھی۔ حضرت کی علالت کا سلسلہ چل رہا تھا، علالت و نقاہت کی وجہ سے کئی ہفتہ سے حضرت گھر سے باہر نکل کر مدرسہ میں بھی نہیں آئے تھے۔ میں پیشگی اجازت لے کر پہلے ہردوئی، پھر حضرت سے گھر ہی پر ملاقات کے بعد بلگرام گیا تھا۔ واپسی کے نظام کے سلسلہ میں حضرت والا نے دریافت کرنے کے بعد یہ فرمایا کہ اگر کوئی زحمت نہ ہو تو صبح کو واپسی میں بھی یہاں آ کر کچھ دیر طلبہ کے سامنے بیان کر دو۔ یہاں پہنچ کر یہ خوشگوار منظر حضرت محی السنۃ کی خرد نوازی کا سامنے آیا کہ کئی ہفتہ کے بعد محض اس راقم الحروف کو نوازنے کے لئے حضرت والا گھر سے مدرسہ آئے تھے۔ بڑی بشاشت کے ساتھ حضرت نے ہم لوگوں کا استقبال کیا، اور پر تکلف ناشتہ کرانے کے بعد مجھے بیان کے لئے مسجد پہنچوا دیا۔ جہاں پہلے سے طلبہ، اور کچھ اساتذہ نیز باہری

حضرات جمع تھے۔ ابھی بیان کے لئے میں کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ حضرت والا خود بھی اپنی وہیل چیئر کے ذریعہ تشریف لائے اور میرے سامنے ہی کچھ فاصلہ پر رک گئے۔ اب میرے لئے یہ ناقابل بیان قسم کا ”امتحانی وقت“ تھا کہ کرسی پر بیٹھنے کے بعد کیا کروں؟ ابھی گھبراہٹ اور سٹپا ہٹ کے عالم میں کوئی فیصلہ کرنے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی کہ حضرت والا کا حکم ہوا کہ بیان شروع کیجئے۔

الامر فوق الأدب کے تقاضے کے مطابق جو کچھ بن پڑا، حضرت کی موجودگی میں عرض کیا، لیکن حق تعالیٰ کی توفیق سے اس بات کا اہتمام کیا کہ اختصار کے ساتھ حضرت والا ہی کی زبان سے مختلف اوقات میں سنی ہوئی کچھ باتوں کو سبق کی طرح سنا دوں۔ ابتدا ہی میں اس کی وضاحت بھی کر دی کہ حضرت کی موجودگی میں کچھ بیان کرنے کی میرے اندر ہمت نہیں ہے، مگر حضرت کا حکم ہے تو ان ہی سے سنی ہوئی کچھ باتوں کو دوہرانے کی کوشش کروں گا۔

حق تعالیٰ کے فضل و کرم اور حضرت کی خصوصی توجہ کے نتیجہ میں کچھ ایسا بیان ہو گیا کہ حضرت والا بہت محظوظ و مطمئن ہوئے اور بیان کے بعد مجھے گلے لگا کر بہت دعائیں دیں۔

میں تو جیسے تیسے اس ”امتحانی مرحلہ“ سے گذر کر واپس آ گیا۔ لیکن بعد میں کچھ احباب خصوصاً حضرت کے منظور نظر مسترشد و مجاز جناب مولانا افضال الرحمن صاحب مدظلہ العالی شیخ الحدیث مدرسہ اشرف المدارس ہردوئی سے یہ علم ہو کر اپنی قسمت پر ناز ہوا کہ میرا وہ بیان ٹیپ ریکارڈ کے ذریعہ محفوظ کر لیا گیا تھا، اور میری واپسی کے بعد بھی حضرت والا نے اسے سنا اور دوسروں کو سنوا کر میرے لئے حوصلہ افزا کلمات فرماتے ہوئے دعاؤں سے نوازا۔

اس طرح یہ سفر حافظ ہاشم ہی کے لئے نہیں، خود میرے لئے بھی ایک ”یادگار سفر“ بن گیا۔ خصوصاً اس وجہ سے بھی کہ اس سفر کے پورے پندرہ دن کے بعد ہی حضرت والا کی وفات ہو گئی۔

اس سفر کے تعلق سے ایک دلچسپ بات قابل ذکر یہ بھی ہے کہ ہردوئی پہنچ کر اور حضرت والا سے ملاقات کے بعد بلگرام جاتے اور واپس آتے ہوئے حافظ ہاشم مرحوم نے مجھ سے کئی مرتبہ کہا کہ آپ سفارش کر کے مجھے حضرت والا سے بیعت کرا دیجئے۔ مگر میں حضرت کے اصول و ضوابط سے کچھ واقفیت رکھنے کی وجہ سے اس کی ہمت نہیں کر سکا، اور میں نے ان سے یہی کہا کہ اگر ایسا ارادہ ہوا تو خاص طور پر ہردوئی کا اسی غرض سے سفر کریئے، اپنی درخواست پیش کریئے۔

پھر قضا و قدر کے فیصلہ نے اس کی مہلت نہیں دی، اور حافظ ہاشم مرحوم ارادہ رکھنے کے باوجود نہ ہردوئی جاسکے، نہ ہی ان کی حضرت والا سے بیعت کی چاہت پوری ہو سکی۔

حضرت کی وفات کے بعد حافظ صاحب مرحوم نے مجھ سے متعدد مرتبہ شکایت آمیز انداز میں کہا کہ آپ کی وجہ سے ہی میں اس سعادت سے محروم رہا۔ اور میں اس کے سوا ان سے کیا کہہ سکتا تھا کہ۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش یہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارماں، پھر بھی تم نکلے

اب ہماری اس دنیا میں نہ حضرت محبی السنۃ موجود رہے، نہ ہی ان کے طلب گار حافظ ہاشم صاحب مرحوم! مگر صالحین سے محبت اور ان سے مربوط رہنے کی خواہشیں و کوششیں ان شاء اللہ حافظ صاحب کے ضرور کام آ رہی ہوں گی۔ اپنے تعلق سے اتنا تو کہہ ہی سکتا ہوں کہ کچھ تو ایسی ادائیں ضرور تھیں حافظ ہاشم صاحب کی کہ۔

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں
فرحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعة

بھائی سید ضیاء الحسن صاحب رفتید و لے نہ از دل ما

خوش جمال، خوش خصال، اور خوش گفتار بھائی سید ضیاء الحسن صاحب بھی ہماری اس فانی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں ان کے بہت قریبی حلقہ کے لوگوں میں تھا، مگر یہ ضرور ہے کہ میں نے انہیں ہمیشہ قمر اور ان کے دیگر بھائی بہنوں کی طرح بھائی صاحب کہہ کر مخاطب کیا، اور انہوں نے بھی جواب میں چھوٹے بھائی کو اپنی شفقتوں سے نوازا۔

میری ان سے تعلق و رشتہ کی کہانی یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں میرا داخلہ مدرسہ تجوید الفرقان لکھنؤ کے درجہ حفظ میں کرایا گیا، جہاں سے پہلے میری تکمیل حفظ قرآن کی اور ۱۹۶۲ء میں تجوید قرآن (بروایت حفصؓ) کی دستار بندی ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب اس مدرسہ کے ناظم بھائی صاحب مرحوم کے والد ماجد مولانا سید نور الحسن صاحب مرحوم تھے اور بھائی صاحب کے چھوٹے بھائی سید قمر الحسن صاحب اسی مدرسہ کے دوسرے درجہ حفظ کے طالب علم تھے۔ یہاں سے میری اور قمر کی دوستی شروع ہوئی جو بعد میں کافی پروان چڑھی اور اس کا سلسلہ کم از کم اس وقت تک ترقی پذیر رہا جب قمر تو دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے شبلی ہاسٹل میں رہ کر اور میں دارالعلوم دیوبند جا کر

اپنے اپنے تعلیمی مراحل طے کرتے رہے، اور ہم دونوں کے درمیان خط و کتابت کے ذریعہ رابطہ مضبوط ہوتا رہا۔ اس وقت کے مدرسہ تجوید الفرقان کا ایک شعبہ نسواں بھی تھا، جو مدرسہ کے عقب جانب مشرق حاجی فقیر محمد صاحب مرحوم (بانی مدرسہ) کی اس کوٹھی میں چل رہا تھا جو موجودہ وقت میں حاجی صاحب مرحوم کے فرزند ان بھائی حاجی محمد علی صاحب وغیرہ کی رہائش گاہ ہے۔ اس نسواں مدرسہ (یا اسکول) میں جہاں درجہ پنجم تک تعلیم ہوتی تھی بھائی صاحب مرحوم کی دو چھوٹی بہنیں سلمیٰ باجی اور نجمہ مرحومہ، اور میری ایک بڑی بہن صفورہ اور چھوٹی بہن عفرات بھی پڑھتی تھیں، جہاں ان لوگوں کی بھی علی قدر مراتب خوب پکی دوستیاں ہو گئی تھیں۔ اس مدرسہ نسواں کے بھی ناظم و نگران مولانا سید نور الحسن صاحب مرحوم ہی تھے (جو ہمارے دور طالب علمی ہی کے درمیان اس مدرسہ کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئے تھے اور بعد میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے درجات عربی کے موقر استاذ مقرر ہو گئے تھے)

میری اور قمر، اور ہم دونوں کی دونوں بہنوں کی دوستیوں نے خوب خوب رنگ جمایا۔ چھٹی کے دنوں میں خاص طور پر جمعہ کے دن اکثر ہم لوگ ایک دوسرے کے گھر دن بھر کے لئے جاتے، دوپہر کا کھانا ساتھ کھاتے، خوش گپیاں کرتے، ہم اور قمر اپنے مشترکہ شوق بچوں کی کتابوں کا تبادلہ کرتے — اور ہم سب کے بڑے، بھائی صاحب مسکرا مسکرا کر ہماری حوصلہ افزائی کرتے اور ضرورت پڑنے پر ہلکی پھلکی تنبیہ بھی کرتے۔ بھائی صاحب کی نئی نئی شادی ہوئی تھی، بھابھی صاحبہ کا حیدر آبادی لب ولہجہ اور کچھ بدلے ہوئے الفاظ و اصطلاحات سے ہم لوگ خوب محظوظ ہوتے تھے اور اکثر بھائی صاحب بھی ہمارے ساتھ شریک ہو کر ہماری خوشیوں و لذتوں میں اضافہ کرتے تھے۔ ان دنوں بھائی صاحب اور ان کا کنبہ محلہ ارادت نگر، ڈالی گنج کے ایک کراپیہ کے مکان میں قیام پذیر تھا۔ والدہ ماجدہ کی وفات ہو چکی تھی، اور والد صاحب ”خود اختیاری گوشہ نشینی“ لے کر زیادہ تر ذکر وادکار یا مطالعہ میں مشغول رہ کر ہم کو

”ہماری آزادیوں“ کے لئے موقع فراہم کر دیا کرتے تھے۔
 داستان خاصی طویل اور دلچسپ ہے (شاید اسے کبھی قلم بند کرنے کا موقع مل جائے) یہاں بہ طور اختصار اس خصوصی اہمیت کی حامل بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ ہماری اور ہماری بہنوں کی دوستیوں پر تو وقت کی رفتار نے گردی تھیں جمادیں۔ قمر دہلی جالیے، بہنوں کی شادی بیاہ نے انہیں دور دور کر دیا۔ مگر بھائی صاحب مرحوم کی شفقتیں مجھے تادم آخر حاصل رہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ اب وہ مجھے تم کے بجائے آپ سے مخاطب کرنے لگے تھے، اور جب جب میں نے اس پر اپنا اعتراض درج کرایا تو انہوں نے مجھے میرے عالم وغیرہ ہو جانے کا حوالہ دے کر مجھے خاموش تو کر دیا لیکن مطمئن نہ کر سکے؟ رع
 اے کاش کہ وہ دن واپس آتے

بھائی صاحب میری تحریروں کے میری بساط سے زیادہ قدر دان تھے۔ انہوں نے وقتاً فوقتاً میرے رسالہ ”البدز“ کا اور میری کتابوں کا بڑے شوق و انتہاک سے مطالعہ کیا اور میرے طرز نگارش پر انہوں نے جس جس طرح اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا وہ میرے لئے اس وجہ سے سند کی حیثیت رکھتی ہے کہ وہ خود ایک وسیع النظر اور کثیر المطالعہ مصنف، ادیب، دانشور، اور بافیض استاذ و مربی تھے۔

آخر میں بھائی صاحب سے آخری ملاقات کا ذکر کر کے اپنی اس تشنگی کا اظہار مناسب سمجھتا ہوں جو ان شاء اللہ اس وقت دور ہوگی جب ہم دونوں جنت میں جمع ہوں گے اور بھائی صاحب یہ کہہ کر مجھے دلا سہ دیں گے کہ ”لو اب تو خوش ہو گئے؟“۔ اس فانی دنیا میں ہماری آخری ملاقات کچھ یوں ہوئی کہ میرے پھوپھی زاد بھائی طارق سلمہ نے مجھے بتایا کہ ضیاء صاحب کا قلبی آپریشن ہونے والا ہے جس کے لئے وہ تین دن کے بعد ایراز ہاسپٹل میں داخل ہوں گے، انہوں نے سلام کہلوا یا ہے اور دعا کے لئے کہا ہے۔ میں یہ تشویش ناک اطلاع پا کر دوسرے ہی دن ان کے گھر گیا تو انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا ارے بھائی میں نے تو دعا کے لئے کہلوا یا تھا آپ نے آنے کی زحمت کیوں کی

(اس میں بھی یقیناً وہ شفقت شامل تھی جو میرے گٹھنوں کے درد کی معذوری کی وجہ سے وہ میرے ساتھ خصوصی طور پر روا رکھتے تھے) بہر حال مختصر گفتگو اور دلا سہ تسلی کے بعد انہوں نے مجھ سے میری کتاب ”یادوں کے جھروکوں سے“ کے مطالعہ کا اشتیاق ظاہر کیا۔ میں نے ممکنہ عجلت کے ساتھ طارق سلمہ کے ذریعہ ان تک یہ کتاب پہنچوا دی مگر معلوم نہیں کہ وہ اس کی ورق گردانی کر بھی سکے یا نہیں؟۔ واپسی کے وقت انہوں نے مجھے تھوڑے سے انگور اپنے پاس رکھے، ایک لفافہ کو خالی کر کے باصرار یہ کہہ کر دیئے کہ ”میری طرف سے بچوں کو دے دینا“۔ یہ تھا ان کا آخری شفقت سے بھرپور تحفہ یا رویہ!

اللہ بس باقی ہوں۔ حق تعالیٰ مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔
 سید ضیاء الحسن مرحوم (جنہیں میں ۱۹۶۰ء کی دہائی سے ان کی وفات تک ”بھائی صاحب“ سے مخاطب کرنے کا عادی رہا) سے میری ذاتی واقفیت اور ان کی بزرگانہ شفقتوں سے بہرہ ور ہونے کی مدت تو اتنی ہی ہے جتنی میرے بچپن، اور بچپن سے جوانی، اور اب جوانی سے بڑھاپے تک پہنچنے کی مدت ہے۔ اس دوران بہت قربتیں بھی رہیں، اور لمبے لمبے وقفوں کی ملاقاتیں بھی رہیں۔ مگر ایک چیز ہمیشہ برقرار رہی کہ وہ جب اور جتنے وقفہ کے لئے بھی ملے، مجھے ”اپنائیت“ کا وہ احساس دلاتے رہے جس کی وجہ سے ان کی ہر ملاقات میرے لئے ”تجدید محبت“ کا کام کرتی رہی۔

اب جب کہ وہ ہماری اس فانی دنیا سے منھ موڑ کر اس طرح رخصت ہو گئے کہ یہاں ان سے مختصر سے مختصر ملاقات بھی نہیں ہو سکتی، اور ان کے صحیح واقفین و قدر دانوں نے ان کی وفات پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے ان کی ”علمی فتوحات“ کا اشاروں اشاروں میں کسی تفصیل کے بغیر ذکر کرتے ہوئے مجھے خواب غفلت سے بیدار ہونے کا موقع فراہم کیا تو میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ میرا ساٹھ برس سے زیادہ طویل مدت پر مشتمل رشتہ بس بھائی صاحب سے شروع ہو کر بھائی صاحب ہی پر ختم ہو گیا۔ اور حیرت کے ساتھ ساتھ

حسرت کی یہ سوغات بھی دے گیا کہ انہوں نے تو میری قدردانی بھی کی اور وقتاً فوقتاً حوصلہ افزائی بھی کی، لیکن میری محرومی یہ کہ میں ان کے ”قد“ ہی کو نہیں پہچان سکا تو قدردانی کیا کرتا؟

میں نے جس دور میں شعور کی آنکھ کھولی، اور اپنے ارد گرد جن پڑھے لکھے اور ”باکار لوگوں“ کو پایا ان میں بڑی تعداد ایسے لوگوں ہی کی پائی جنہیں اپنی ”عظمتوں کے قصیدے“ بیان کرنے کے لئے اپنی ہی زبان یا اپنے ہی قلم کا بے تکلف استعمال کرتے ہوئے دیکھا، جنہوں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے اپنے آپ کو مخزنِ علم و ادب، صاحبِ طرز ادیب و انشاء پرداز اور رموز آشنا و قادر الکلام شاعر ہی نہیں، بلکہ ضرورت پڑنے پر علامہ، مفتی، قائد، اور مصلح دوراں تک بنا کر پیش کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ پھر قسمت نے یادری کی تو ”من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو“ والا حلقہ یاراں بھی مل گیا، اور دیکھتے دیکھتے انہیں ”واقعی عظیم“ تسلیم کر لیا گیا۔ اور کچھ وہ بھی آئے جن کی قسمت نے ان کے ساتھ مہربانی کا معاملہ نہیں کیا اور وہ جھنجھلا کر دنیا کی ناقدری اور مایوس ہو کر ادب و ادیب، نیز علم اور عالم کی ناقدری کا شکوہ کرتے ہوئے رہ گئے؟۔

جیسا کہ میں نے سطور بالا میں عرض کیا کہ بڑی تعداد تو میں نے ان ”بقلم خود“ لوگوں ہی کی پائی، تاہم ان ”چھوٹی تعداد“ کے لوگوں سے بھی ملاقاتیں ہوئیں، انہیں پایا اور برتا بھی، جنہوں نے اپنا تعارف خود نہیں کرایا بلکہ وہ اپنے کارناموں اور صلاحیتوں کے ذریعہ اپنی زندگی ہی میں نہ صرف متعارف بلکہ ”مسلم“ ہو گئے؟۔

بھائی صاحب مرحوم کے قدردانوں اور ان کے مرتبہ شناسوں سے معذرت کے ساتھ میں کہنا چاہتا ہوں کہ میرے خیال میں بھائی ضیاء الحسن صاحب کا شمار پڑھے لکھے اور باکار لوگوں کی درج بالا قسموں میں سے کسی میں نہیں کیا جاسکتا۔ اور شاید اسی لئے وہ میرے جیسے ”آشنائی کے دعویدار“ کے لئے بھی ”غیر متعارف“ ہی رہے اور میں انہیں بھائی صاحب بھائی صاحب

ہی کہتا رہ گیا۔

باہمہ ذوق آگہی ہائے یہ نسبتی بشر
سارے جہاں کا جائزہ اپنے جہاں سے بے خبر

خدا بھلا کرے بھائی صاحب کے چھوٹے بھائی اور میرے عزیز دوست سید قمر الحسن کا کہ جنہوں نے بھائی صاحب کی علمی میراث تک پہنچ کا سامان اس طرح کر دیا کہ انہوں نے اپنے برادرِ معظم کی وفات کے فوراً ہی بعد اپنی ایک ”وہائس ایپ پوسٹ“ کے ذریعہ یہ اعلان کرتے ہوئے کہ وہ جلد بھائی صاحب کے حالات زندگی پر ایک کتاب مرتب کر کے شائع کرنا چاہتے ہیں، بھائی صاحب کے حلقہ احباب سے یہ اپیل کی کہ مرحوم کے سلسلہ میں اپنے تاثرات ان کے احباب و رفقاء اور اعزہ و اقرباء مجھے بھیجیں تاکہ انہیں اس مجوزہ کتاب میں شامل کیا جاسکے۔ عزیز بھائی سید قمر الحسن نے (جنہیں مساویانہ طور پر اب دوست کہتے ہوئے بھی اس لئے جھجھک ہو رہی ہے کہ ان کے سلسلہ میں یہ بھی دریافت ہوئی کہ موصوف بھی کئی کتابوں کے مصنف ہو کر ”ادیبوں و دانشوروں“ کے زمرہ میں داخل ہو چکے ہیں۔ یعنی۔

پوچھ گیتے تھے کبھی جو خاکساروں کا مزاج
کہتے ہیں وہ لوگ بھی اب صاحبِ محفل ہوئے

مجھ پر یہ خصوصی عنایت کی کہ مجھ سے باصرار کہا کہ تم بھی بھائی صاحب پر ایک ایسا مضمون لکھو جس میں کچھ ان کے احوال ہوں، اور میری درج بالا اس فوری اور مختصر تاثراتی تحریر کو اس لئے ناکافی قرار دیا کہ اس میں تو صرف گھریلو رشتوں اور تعلقات کا ذکر ہے۔ بھائی قمر کی اس تجویز نے میرے اندر بھی تحریک پیدا کی، لیکن رکاوٹ وہی اپنی غفلت و بے خبری تھی جس نے سید ضیاء الحسن مرحوم کی اس حیثیت کو اب تک مجھ سے اوجھل رکھا تھا۔ اس رکاوٹ کو ”لاک ڈاؤن“ کے باوجود بھائی قمر الحسن نے بھائی صاحب کی چار کتابیں فوری طور پر فراہم کر کے دور کر دیا۔

کرنے کے ساتھ ہی ملک زادہ صاحب مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے بہت ہی نپے تلے الفاظ میں ان سے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کیا ہے — اس مضمون کی خاص بات جو مضمون نگار کی ذہانت و جودت کو ظاہر کرنے والی ہے، وہ ہے جس کو خود مضمون کے الفاظ میں ملاحظہ کریں:

”یہاں ایک بات لکھنا چاہ رہا ہوں وہ یہ کہ ۲۲/اپریل ۲۰۱۶ء یعنی ملک زادہ صاحب کے انتقال کے بعد ان سے متعلق کئی مضامین نظر سے گذرے تقریباً ہر مضمون میں ایک بات مشترکہ نظر آئی یعنی ”ملک زادہ کا میدان کار صرف مشاعروں کی نظامت ہی نہ تھا بلکہ وہ ایک عالم و فاضل، ادیب و نقاد اور باکمال شاعر بھی تھے۔ ان کا اپنا ادبی سراپا بہت بلند تھا“ ان جیسے جملوں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کچھ حضرات ”نظامت“ کو ایک کمتر درجہ کی چیز سمجھتے ہیں، حالاں کہ ”نظامت“ کوئی معمولی چیز نہیں ہے اور یہ ہر شخص کے بس کی بات بھی نہیں..... نظامت کے لئے دور اندیشی، دور بینی، بے باکی، برجستگی، اور حق گوئی کی ضرورت ہوتی ہے..... کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ملک زادہ منظور صاحب کی شہرت نظامت ہی کی رہیں منت ہے۔ کیا ان جیسی نظامت ہر ایک کر سکتا ہے؟..... ملک زادہ صاحب کی ایک درجن سے زائد کتب، ابوالکلام آزاد پر تحقیقی مقالے، تنقیدی مطالعے، خودنوشت سوانح عمری اور شعری مجموعے بلاشبہ اہم ہیں..... لیکن اس حقیقت سے کسے انکار ہے کہ ”نظامت“ نے ہی انہیں عوام و خواص دونوں سے روشناس کرایا اور اسی نظامت کے ذریعہ ہی انہیں

شہرت عام اور بقائے دوام حاصل ہوا۔“ ص ۱۰۰-۹۹

مضمون نگار نے جس پختگی، اعتماد اور وثوق کے ساتھ ملک زادہ صاحب

مرحوم کی نظامت کو ان کے تمام تر علمی و ادبی ورثہ کے مقابلہ میں دلائل کے ساتھ ان کا ”وصف امتیازی“ قرار دیا ہے۔ اس سے اختلاف تو کیا جاسکتا ہے لیکن مضمون نگار کی وسعت نظر اور تجزیہ نگاری کی بھرپور صلاحیت سے اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔

دوسرے نمبر پر ان کی کتاب ”قدوائیوں کے مورث اعلیٰ“ ایک تحقیقی مطالعہ، کا ذکر اس لئے کہ یہ کتاب ان کی تحقیق و جستجو، کثرت مطالعہ، اور مراجع و مآخذ سے استفسار و استنباط کی صلاحیتوں کی آئینہ دار ہے۔ صرف ۶۰ صفحات مشتمل یہ کتاب ”بقامت کہتر و بہ قیمت بہتر“ کی مصداق ہے۔ لکھنؤ کے اطراف خصوصاً ضلع بارہ بنگی کے مختلف مواضع میں مسلم شرفاء کا ایک مشہور خانوادہ ”قدوائی“ کے نام سے آباد ہے جس کے مورث اعلیٰ شیخ معز الدین المعروف بہ ”قاضی قدوہ“ تھے۔ ماضی قریب کی اہم علمی، ادبی و سیاسی شخصیات میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مولانا عبدالسلام قدوائی، رفیع احمد قدوائی، شفیق الرحمن قدوائی اور اخلاق الرحمن قدوائی وغیرہم کا تعلق اسی خانوادہ سے تھا۔ موجودہ علمی، ادبی و سیاسی بساط پر بھی اس خانوادہ کے متعدد افراد، اپنی تمام تر وجاہتوں کے ساتھ جلوہ فگن ہیں۔

قدوائیوں کے مورث اعلیٰ قاضی قدوہ کے سلسلہ میں درج ذیل چند باتیں معروف و مسلم ہیں:

ان کا اصل نام معز الدین تھا۔ وہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے خواجہ تاش تھے یعنی دونوں ہی حضرت خواجہ عثمان ہاروی سے بیعت و مجاز تھے۔ ان کا تعلق رومی سلاطین کے خاندان سے تھا۔ وہ اپنے پیرومرشد کے حکم و ایما سے شہاب الدین غوری کے عہد سلطنت میں ہندوستان آئے اور یہاں اولین قیام اپنے خواجہ تاش حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے پاس اجمیر میں کیا۔ بادشاہ وقت نے ان کے علمی اور روحانی و عرفانی مقام کی قدر کرتے ہوئے انہیں

منصب قضاء پر فائز کیا، اس طرح وہ ”قاضی قدوہ“ کے نام سے ایسا مشہور ہوئے کہ یہی لقب ان کی شناخت بن گیا اور ان کے اصل نام سے واقفیت کم ہی لوگوں کو رہ گئی۔ وہ ایک کثیر الاولاد بزرگ تھے، ایک روایت کے مطابق ان کی اولاد کی کل تعداد ۷۲ تو دوسری روایت کے مطابق ۵۲ تھی اور اسی مناسبت سے بارہ بنکی میں ایک مثل مشہور ہے ”باون گاؤں قدوہ“ سب سے بڑا بھیا رہا۔ بادشاہ وقت نے ان کی قدر افزائی کرتے ہوئے ان کے ہر بچے کے نام سے ایک موضع بطور جاگیر عطا کی تھی، جہاں آج بھی قدوائی خاندان کے کم یا زیادہ افراد آباد ہیں۔

اسی طرح قاضی قدوہ کے سلسلہ میں چند باتیں ایسی ہیں جو اختلافی و نزاعی ہیں اور ان کے مختلف سوانح نگاروں کی آراء کے درمیان اختلاف ہے: مثلاً زیادہ تر سوانح نگاران کے آباء و اجداد کے نام اور ان کے احوال کا پتہ نہیں لگا سکے، جب کہ مشہور عالم و محقق مولانا عبدالسلام قدوائی نے اپنے شجرہ میں قاضی قدوہ کے والد کا نام میرک شاہ اور دادا کا نام سلطان ابوعلی درج کیا ہے؟ لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا ہے کہ اس سلسلہ میں ان کا ماخذ کیا ہے اور دیگر تمام سوانح نگاروں اور دوسرے مقام پر خود اپنے ہی اس بیان کے برعکس کہ قاضی قدوہ کے آباء و اجداد کا نام معلوم نہیں ہو سکا ہے، اس شجرہ میں انہوں نے ان کے باپ دادا ہی نہیں حضرت آدم علیہ السلام تک تمام بزرگوں کے نام کہاں سے درج کئے اور ان کی تصدیق کیوں کر ہو؟ عموماً تمام مؤرخین و محققین نے قاضی قدوہ کا شمار شیوخ میں کیا ہے، جب کہ بعض حضرات نے ان کا شمار سادات میں کیا ہے؟ قاضی قدوہ کی جائے قیام اجودھیا (جہاں ۱۹۹۲ء تک ان کی قبر بھی موجود تھی) پہلے سے ایک آباد بستی کی صورت میں موجود تھی، اور بادشاہ وقت نے انہیں وہاں کا قاضی مقرر کیا تھا، جب کہ بعض دیگر حضرات کے مطابق قاضی قدوہ ہی نے اجودھیا کو آباد کر کے ایک بستی کی صورت عطا کی تھی؟ سب سے بڑا اختلاف ڈاکٹر کبیر احمد نے کیا ہے، جس کی تفصیل میں سید ضیاء الحسن

صاحب یوں رقم طراز ہیں:

”حضرت قاضی قدوہ کے بارے میں مختلف کتب تواریخ میں جو کچھ موجود ہے، اس کی صحیح سند نہ ملنے اور تصدیق نہ ہونے کی وجہ سے بعض حضرات اسے شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، مثلاً ڈاکٹر کبیر احمد لکھتے ہیں ”قاضی قدوہ کے متعلق کوئی تفصیل یا معلومات مؤلف کو حاصل نہ ہو سکیں اس لئے قاضی صاحب کی تاریخی شخصیت کی حیثیت مبہم ہو جانے کی وجہ سے ان سے منسوب اور متعلق دیگر باتیں مشکوک سمجھنے میں کسی کو روکا نہیں جاسکتا۔“ ص ۴۳

مندرجہ بالا عبارت کے بعد ڈاکٹر صاحب موصوف حاشیہ پر مزید تحریر فرماتے ہیں کہ ”معتبر کتب تاریخ میں کسی قاضی قدوہ نامی شخص کا شہر اودھ (اجودھیا) میں بطور حاکم یا قاضی شہر آنا ثابت نہیں نیز متذکرہ بالا حوالہ میں تقریباً نو سو سال پہلے کا واقعہ بتلایا گیا ہے۔ اور اس زمانہ میں شہر اودھ (اجودھیا) میں مسلمانوں کی تھوڑی سی آبادی تو ضرور تھی لیکن اس شہر کی حیثیت ”اسلامی اسٹیٹ“ جیسی تو تھی نہیں جس میں ”قاضی شہر“ رہتا تھا اور جو مسلمانوں کے متنازعہ مسائل اور معاملات کا اسلامی قوانین کے مطابق فیصلہ کرتا تھا۔“ صفحہ ۴۴

ڈاکٹر کبیر احمد صاحب ”تاریخ گم گشتہ حالات اجودھیا“ پہ نقد کرتے ہوئے آگے یوں رقم طراز ہیں:

”پتہ نہیں مؤلف کتاب نے بلا تحقیق و سند کیوں کر لکھ دیا کہ آپ بطور حاکم یا قاضی شہر اجودھیا میں تشریف لائے تھے؟ مؤلف کو چاہئے تھا کہ وہ تحقیق کے ساتھ یہ تحریر فرماتے کہ فلاں بادشاہ کے وقت میں یہ فلاں جگہ سے آئے تھے اور فلاں عہدہ پر کام کرتے

تھے۔“صفحہ ۲۵

ڈاکٹر کبیر احمد صاحب کی مندرجہ بالا تحریروں سے تو قاضی قدوہ کا وجود ہی مشکوک ہے۔ (قدوائیوں کے مورث اعلیٰ..... صفحہ ۲۳-۳۳)

قدوائیوں اور ان کے مورث اعلیٰ قاضی قدوہ سے متعلق درج بالا تمام باتیں سید ضیاء الحسن مرحوم کی اسی کتاب سے ماخوذ ہیں، جن سے مؤلف کی تحقیق و جستجو اور اپنے موضوع سے متعلق دستیاب مواد سے استفادہ کے لئے جدوجہد کا بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے راقم الحروف پر یہ بھی انکشاف ہوا کہ ہمارے ملک ہندوستان کے نجیب و شریف عجمی النسل مسلم خانوادوں میں قدوائیوں اور ان کے مورث اعلیٰ کے احوال و کوائف کے سلسلہ میں اہل علم و فضل نے جتنی تحقیق و جستجو کی ہے شاید ہی کسی دوسرے خانوادہ کے لئے اتنی کوشش کی گئی ہو۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ خود قاضی قدوہ کے حسب و نسب حتیٰ کہ ان کے آباء و اجداد کے ناموں تک بھی رسائی حاصل نہیں کی جاسکی، جب کہ خود ان کے اور ان کے اخلاف کے علمی، ادبی، سیاسی، اور سماجی کارناموں، اور ان کے فضل و کمال سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے؟

ان دو کتابوں کے کچھ تفصیلی ذکر کے بعد سید ضیاء الحسن مرحوم کی دستیاب دیگر دو کتابوں ”شاہ مصطفیٰ علی اثیر“ حیات و شاعری“ اور ”حیات نور“ کا سرسری ہی سہی تذکرہ مناسب ہوگا۔ اگرچہ یہ دونوں کتابیں اول الذکر دو کتابوں کے مقابلہ میں ضخیم بھی ہیں اور راقم الحروف کے ذوق مطالعہ سے کافی ہم آہنگ بھی۔ خصوصاً ”حیات نور“ تو وہ کتاب ہے جس سے ایک جذباتی لگاؤ بھی ہے، کیوں کہ یہ کتاب بھائی ضیاء الحسن صاحب کے والد ماجد اور ہمارے اولین و محبوب ”ناظم صاحب“ کے حالات زندگی کے بیان پر مشتمل ہے، اور اس کی ترتیب میں ضیاء الحسن صاحب کے ساتھ ساتھ ان کے چھوٹے بھائی اور

ہمارے عزیز دوست سید قمر الحسن صاحب بھی برابر کے، بلکہ کچھ بڑھ چڑھ کر شریک رہے ہیں۔ تاہم چوں کہ اس تحریر میں کتابوں پر تبصرہ نہیں، بلکہ سید ضیاء الحسن مرحوم کے حوالہ سے ان کی چند کتابوں کا تذکرہ ہی مقصود ہے۔ اس لئے ان دونوں کتابوں کے سرسری ذکر ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

مشہور اور قد آور شخصیات پر لکھنا آسان بھی ہوتا ہے اور بسا اوقات لکھنے والا خود بھی اسی ذریعہ سے متعارف و مشہور ہو جاتا ہے، جب کہ گوشہ گم نامی میں پڑے ہوئے ہیروں کو تلاش کرنا اور انہیں جاذب نظر بنا کر پیش کرنا ”جوہر شناسی“ کی صلاحیت کے بغیر ممکن نہیں ہے؟۔ پھر اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کوئی ”نفع عاجل“ کا طلب گار اس ”کار دشوار“ کو انجام دینے کا ارادہ نہیں کر سکتا۔ اس کام کا بیڑا اٹھانے کی ہمت وہی کر سکتا ہے جس کا کاغذ و قلم کے ساتھ رشتہ مخلصانہ بھی ہو، اور اس وسیلہ سے وہ شہرت کے بجائے احساسات کی ترجمانی اور فرض کی ادائیگی کا طالب ہو؟۔ شاہ مصطفیٰ علی اثیر کی حیات و شاعری پر کوئی باقاعدہ کتاب لکھنا، اور ان کی شاعرانہ عظمت کو دل میں بساتے ہوئے ان کے منتشر و غیر مرتب کلام کو حاصل کر کے، اسے ترتیب و تدوین کے مراحل سے گزار کر باقاعدہ شائع کرانا، سید ضیاء الحسن صاحب کا ”ایک کارنامہ“ اس لئے قرار دیا جائے گا کہ ایک نسبتاً گم نام لیکن خدارسپیدہ شاعر کی شخصیت اور اس کے کلام سے اس درجہ کے شغف و انہماک کو ”نفع عاجل“ سے نظریں ہٹا کر حق دار کو اس کا حق دلانے کی ایک ”سعی مشکور و محمود“ کے سوا کسی دوسرے نام سے یاد نہیں کیا جاسکتا۔ کیوں کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کا شوق کے ساتھ مطالعہ صاحب کتاب یعنی ”شاہ مصطفیٰ علی اثیر“ یا مرتب کتاب یعنی ”سید ضیاء الحسن صاحب“ کے مخصوص حلقوں میں ہی کئے جانے کی توقع ہے۔ اور اس حقیقت سے باخبر ہوتے ہوئے بھی اس کتاب کی تالیف اور ترتیب و تدوین میں اپنی توانائیاں صرف کرنا، مؤلف و مرتب کے ”اخلاص نیت“ کا غماز ہے۔ حق تعالیٰ قبول فرمائے۔ (آمین)

جہاں تک دوسری کتاب ”حیات نور“ کا معاملہ ہے تو اس کی فہرست مضامین پر نظر ڈالتے ہی ایک آرزو یہ پیدا ہوئی کہ ”بھائی صاحب، اور ان سے زیادہ کتاب کے دوسرے مرتب سید قمر الحسن کو راقم الحروف کی یاد بھی آگئی ہوتی تو اسے بھی ”احسان شناسوں“ کی فہرست میں جگہ مل گئی ہوتی؟۔ اس کتاب کی طلب و جستجو تو کافی عرصہ سے تھی، مگر مطالعہ کا موقع اب مل سکا۔ اور وہ بھی سرسری۔ کیوں کہ باقاعدہ تفصیلی مطالعہ جستہ جستہ ان شاء اللہ کروں گا۔ کتاب بہت خوب ہے۔ اور یہ ہونا بھی چاہئے، کیوں کہ کتاب کے دونوں مرتبین، صاحب کتاب یعنی مولانا سید نور الحسن صاحب مرحوم کے فرزند ان ہیں۔ اور اس جذباتی رشتہ کو نباہنے اور اس کا حق ادا کرنے میں اپنی جانب سے انہوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔

اس کے باوجود خاص وجہوں سے یہ کتاب میرے لئے ”غیر متوقع“ ثابت ہوئی۔ پہلی وجہ یہ کہ میں اس کتاب کی زیارت و سرسری مطالعہ سے پہلے تک یہ سمجھتا تھا کہ اس کتاب کے مؤلف و مصنف تنہا سید ضیاء الحسن صاحب ہیں، جب کہ یہ میری غلطی یا ناگجھی ثابت ہوئی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ میں اسے مولانا سید نور الحسن کی ایک باقاعدہ سوانح باور کرتا تھا جب کہ میرا یہ اندازہ بھی غلط ثابت ہوا۔ کیوں کہ یہ متعدد مشاہیر کے تاثراتی و مشاہداتی مضامین پر مشتمل ایک حسین و قیمتی گلدستہ ہے۔ تاہم وہ نہیں جو میں سمجھ رہا تھا؟۔ اس کتاب میں شامل مضامین اگرچہ مختلف اہل قلم کی تاثراتی تحریروں پر مشتمل ہیں لیکن اس کی خوبی یہ ہے کہ مولانا سید نور الحسن صاحب مرحوم کی زندگی کے تقریباً تمام پہلوؤں کو اجاگر کر دیا گیا ہے، خود سید ضیاء الحسن صاحب کے پانچ الگ الگ عکس حیات کو پیش کرنے والے مضامین ہیں۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ مرتبین کے انتخاب مضامین اور ترتیب کی خوش سلیقگی نے اس کتاب کے ذریعہ ”سوانحی ضرورت“ کو پورا کر دیا ہے۔

بھائی صاحب یعنی سید ضیاء الحسن صاحب مرحوم کی کتابوں کو پیش نظر رکھ کر ان پر اپنے کچھ تاثرات کو پیش کرنے کو ”تلافی مافات“ کی ایک کوشش سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے کیوں کہ اسے میری غفلت کوشی سے زیادہ مرحوم کے ”اخفائے حال“ کا کرشمہ سمجھنا چاہئے کہ نصف صدی سے زائد کے تعلق، اور کاغذ و قلم سے کسی نہ کسی درجہ کا رشتہ ہونے کے باوجود میں بھی ان کی پوری زندگی میں یہ نہ جان سکا کہ وہ اتنا متنوع اور مفید قلمی سرمایہ اپنے قدر دانوں کے لئے پیش کر چکے ہیں؟ اور بس یہی تھا ان کا وہ وصف خاص جو آج کی نمود و نمائش کی دنیا میں خال خال ہی نظر آتا ہے۔ اسی کے ساتھ ان کی تواضع و بے نفسی کا یہ انداز بھی قابل دید ہے کہ انہوں نے سخت محنت و جاں فشانی سے تدوین و ترتیب دی ہوئی اپنی کتابوں کے دیباچوں میں اپنے چھوٹے بھائی قمر الحسن کا بھی شکریہ ادا کیا ہے، کیوں کہ کسی کتاب کی ترتیب میں انہوں نے تعاون کیا تو کسی کی کمپوزنگ و تصحیح ان کی ”مرہون منت“ رہی۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کی جدائی کی کسک ان کے اپنے اعزہ و اقرباء سے لے کر ان کے حلقہ احباب کے تقریباً سب ہی خرد و کلاں پوری شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہوئے زبان حال سے یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ع

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

اور یہ تو ہونا ہی چاہئے کیوں کہ انسانی تاریخ کے سب سے بڑے اور سب سے معتبر رہبر، محسن اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے عظمت و سر بلندی حاصل کرنے کا فارمولہ بیان کرتے ہوئے صاف اور واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ من تواضع لله رفعه الله (جو اللہ کی خاطر انکساری اختیار کرے اللہ اسے سر بلند کریں گے) یقیناً خوش بخت و خوش خصال رہے سید ضیاء اللہ صاحب مرحوم کہ انہوں نے نبوی فارمولہ پر عمل کرتے ہوئے سرخ روئی و سر بلندی حاصل کی۔

دل میں یاد غم بے کراں رہ گئی

جانے والا گیا داستاں رہ گئی

ایک دیا اور بجھا اور بڑھی تاریکی

۲۶ ذیقعدہ ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۸ جولائی ۲۰۲۰ء کو نماز فجر کے بعد مسجد سے واپسی پر گھر کا ماحول کچھ بدلا بدلا پایا۔ معمول کے خلاف گھر کے کئی افراد کو اپنے کمرہ میں اس طرح خاموش پایا جیسے وہ کوئی اہم خبر سنانے کے لئے میرے منتظر ہوں۔ بالآخر میرے استفسار پر میرے فرزند اصغر مولوی معاویہ عبدالرحیم نے انتہائی غمگین لہجہ میں بتایا کہ کانپور سے اطلاع آئی ہے کہ مولانا اسامہ قاسمی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)۔

میرے لیے یہ خبر بالکل غیر متوقع اور اندوہناک تھی کیونکہ مجھے ان کی علالت کی کوئی خبر نہ تھی۔ خبر ایسی تھی کہ کوشش کے باوجود میں اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکا۔ دیر تک کلمہ ترجیع کے ورد کے ساتھ ساتھ آنسو بہاتا رہا۔ پھر بوجھل اور غمگین دل کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول ہوا جس میں مسلسل آنے والے فون سے خلل بھی پڑتا رہا۔ بہر حال حسب توفیق تلاوت اور ایصال ثواب کے بعد اپنے اور مولانا مرحوم کے متعلقین و خیر خواہوں کو اس اندوہناک حادثہ کی اطلاع دینے کے لیے ایک مختصر تحریر ٹائپ کر کے واٹس ایپ کے ذریعہ میسج کی جو حسب ذیل تھی۔

آج بعد نماز فجر میرے فرزند اصغر معاویہ عبدالرحیم سلمہ نے مولانا محمد متین الحق اسامہ قاسمی کی وفات کی اچانک اطلاع دی تو آنکھیں اشکبار اور دل

غمگین ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ تھوڑی عمر پائی مگر اللہ تعالیٰ نے ان سے دین و ملت کے بہت کام لئے، جو ان شاء اللہ ان کے لئے ذخیرہ آخرت بنیں گے۔ ہماری جماعت اور صف علماء کے لئے وہ ایک بہت قیمتی سرمایہ تھے۔ لاک ڈاؤن کے دوران متعدد اہل خاندان و اہل تعلق کی جدائی کے صدمات سے دوچار ہونا پڑا، لیکن مولانا اسامہ قاسمی مرحوم کی وفات جیسا دل پر اثر نہیں ہوا۔ زخم تازہ ہے مسلسل فون آرہے ہیں اس لیے دل پر بہت اثر ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کس کس سے تعزیت کی جائے؟۔ حق تعالیٰ کی ایک قیمتی امانت تھی، اس نے واپس لے لی تو کسی کا کیا زور۔ بس صورت حال کچھ یوں ہے کہ۔

زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کئے

آشیاں جلتا رہا اور ہم ناتواں دیکھا کئے

حق تعالیٰ ان کے ساتھ اپنے شایان رحمت اکرام کا معاملہ فرما کر ان کا شمار شہداء میں فرمائے۔ اور ان کے جملہ ورثاء و متعلقین کو صبر جمیل اور اس کا اجر جزیل مرحمت فرمائے۔ آمین۔ آخر میں یہ بھی دعا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے نبی کی امت کو اسامہ قاسمی جیسا مخلص پیما اور معتبر قائد عطا فرمائے و ماذلک علی اللہ بعزیز۔ دل و دماغ کی حالت کچھ استوار ہونے پر ان شاء اللہ ان کی شخصیت اور اپنے خصوصی تعلق پر کچھ رقم کرنے کی کوشش کروں گا۔ ان کے اپنے ایک عزیز کی حیثیت سے بھی اور ملت کے ایک بے لوث و بے ریا خدمت گذار کی حیثیت سے بھی بڑے حقوق ہیں۔ ع

جانے والا گیا داستاں رہ گئی

فقط

عبدالعلی فاروقی لکھنؤ

۱۸ جولائی ۲۰۲۰ء

اس تحریر اور پھر فون پر ہوتی رہنے والی گفتگو نے میرے بعض مخلص احباب کو اتنا متاثر کیا کہ وہ ہر طرح میری دلجوئی میں لگ گئے۔ میرے کچھ مخلص خردوں و شاگردوں نے تو خود میری طرف سے اپنی فکر مندی کا اظہار کیا اور مجھ سے باقاعدہ تعزیت کرتے ہوئے مجھے ہر طرح صبر کی تلقین کی۔ میرے ایک مزاج آشنا اور محبت کرنے والے شاگرد مولوی ابوالحسنات ندوی نے تو یہاں تک تحریر کیا کہ.....

”صدر صاحب! میں نے جو دیکھا کہ آپ اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ قربت اور محبت مولانا اسامہ صاحب کیلئے رکھتے تھے۔ یقیناً وہ آپ کے بہت ہی مخلص دوست ہونگے، آپ بھی تعزیت کے مستحق ہیں۔ کا کوری کے ایک جلسے میں آپ نے ان کی تقریر ان کے بغل میں بیٹھ کر سنی اور آپ بہت محفوظ ہو رہے تھے حالانکہ اپنی تقریر کے بعد بیٹھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اللہ مولانا مرحوم کی مغفرت فرمائے اور آپ کو اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ اور آپ بھی ہمارے لئے سرمایہ ہیں، اس وبازدہ زمانے میں اپنا خاص خیال رکھیے، اللہ آپ کی عمر دراز فرمائے اور ہمیں مستفید ہونے کے مواقع عطا فرمائے۔“

اس تحریر کے جواب میں میں نے عزیز موصوف کو لکھا کہ ”بھائی یوں تو وہ مجھ سے عمر میں بہت چھوٹے تھے۔ بس اسی سے اندازہ کرو میری دارالعلوم دیوبند سے فراغت ۱۹۷۰ء کی، اور ان کی ۱۹۸۹ء کی ہے۔ وہ تو عبد الولی سے بھی کئی برس چھوٹے تھے۔ مجھے تو وہ ہمیشہ ”حضرت“ سے مخاطب کرتے تھے، جو یقیناً ان کے تواضع و بے نفسی کی بات تھی۔ بات دراصل

یہ ہے کہ وہ ایک بہت ہی قیمتی، فعال اور باغیرت عالم تھے۔ احقاق حق اور ابطال باطل میں ان کی نظیر آسانی سے نہیں مل سکے گی۔ صرف ۵۳ برس عمر پائی، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان سے دین و ملت کا اتنا کام لیا کہ ان سے دو گنی عمر پا کر بھی لوگوں کے لئے آسان نہیں ہوتا۔ نہایت خلیق، متواضع، اور سرگرم عمل انسان تھے۔ ان ہی خوبیوں کی وجہ سے وہ واقعی مجھے بہت عزیز تھے۔ حقیقت یہی ہے کہ.....؟

وماکان قیس ہلکە ہلک واحد
ولکنہ بنیان قوم تہدما
اللہ تعالیٰ بال بال کی مغفرت فرما کر اعلیٰ علیین میں مقام مرحمت فرمائے، آمین۔“

کانپور اور لکھنؤ کے درمیان اس طرح روابط و اتصال ہیں کہ بچپن سے ابھی چند برس پہلے تک سال میں اتنی مرتبہ اور اتنی نسبتوں سے کانپور جانا آنا ہوتا تھا جیسے وہ لکھنؤ کا کوئی محلہ ہو۔ کانپور کی دیگر خصوصیات کے ساتھ ہی وہاں کی ایک خصوصیت متعدد و اہم خدمت گزار مدارس کے ساتھ ہی کثیر تعداد میں سرگرم عمل علماء کرام کی موجودگی اور ان کی مساجد سے وابستگی بنی رہی۔ لکھنؤ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء جیسے بین الاقوامی شہرت و عزت کے حامل مدرسہ اور اس سے وابستہ علماء کی کھپ کی موجودگی کے باوجود علماء اور عوام کے درمیان وہ جوڑ اور ربط نہیں تھا جو کانپور میں تھا، جس کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ وہاں کی بیشتر مرکزی اہمیت کی حامل مساجد کے امام و خطیب علماء مدارس ہی ہوا کرتے تھے جبکہ لکھنؤ میں ایسا نظام نہ ہونے کی وجہ سے علماء اور عوام کے درمیان کانپور جیسے روابط نہیں تھے۔ کانپور میں وہ مرکزی مدرسہ اب بھی قائم و موجود ہے جہاں سے

وابستہ رہ کر حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے اپنے فیوض کے دریا بہائے۔ پھر ان کے بعد مفتی اعظم ہند استاذ مکرم حضرت مفتی محمود صاحب، حضرت مولانا ظفر الدین صاحب اور ان کے برادر خرد حضرت مولانا وحی الدین صاحب، پھر حضرت مولانا مفتی منظور احمد مظاہری، قاضی احمد حسن، مولانا مبین الحق قاسمی، مولانا عبدالقیوم مظاہری اور مولانا وکیل احمد قاسمی جیسے متعدد فعال و افسین علماء کرام سے تو خوب خوب ملاقاتیں ہوئیں، ان کے ساتھ دینی جلسوں میں شرکت کے ساتھ ہی نجی مجلسوں میں ان کے ساتھ بیٹھنے اور ان کی گہر بار گفتگوؤں سے فیضیاب ہونے کے مواقع ملتے رہے۔ پھر قانون فطرت کے مطابق اپنے اپنے حصہ کے مفوضہ کاموں کو انجام دینے کے بعد ایک ایک کر کے ہمارے یہ عمل و گہر زیر زمین دفن ہوتے گئے اور ان کے اخلاف میں ان جیسی صلاحیتوں و برکتوں کی حامل شخصیتوں کی کمی دن بہ دن بڑھتی گئی۔ یوں تو مرحوم مولانا اسامہ قاسمی نے اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے نوجوانی کے دور اور اپنے بڑوں کی موجودگی ہی سے مقبولیت و ہرلعزیزی کا سفر شروع کر دیا تھا لیکن حضرت مولانا مفتی منظور احمد (جنہوں نے اپنی زندگی ہی میں انہیں اپنا جانشین و قائم مقام قاضی شہر منتخب کر لیا تھا) کی وفات کے بعد تو وہ کانپور کے عوام ہی نہیں بلکہ علماء کے بھی سرخیل ہو گئے تھے اور ان کی اچانک وفات سے اصاغرو اکابر سب ہی پر سننا چھا گیا ہے اور ہر ایک کی زبان پر بس ایک ہی سوال ہے کہ جامعہ محمودیہ اشرف العلوم، جمعیت علماء اتر پردیش، رابطہ مدارس دارالعلوم دیوبند، دارالقضاۃ اور حق ایجوکیشنل سوسائٹی اور ان جیسے کئی دیگر بڑے اداروں اور تنظیموں کی اپنے کاندھوں پر ذمہ داریاں اٹھا کر اپنے منتخب و فعال معاونین کے ساتھ مسلسل خدمات انجام دینے والی مولانا اسامہ قاسمی جیسی شخصیت آسانی کے ساتھ کہاں اور کیسے مل سکے گی؟ اور ان کی رحلت سے پیدا ہونے والا ایک

بڑا خلا کیونکر پر ہوگا؟

مولانا اسامہ قاسمی کے والد ماجد مولانا مبین الحق قاسمی مرحوم بھی ایک کامیاب و مقبول استاذ اور ایک متحرک منتظم ہونے کے ساتھ ہی نہایت خوش مزاج و خوش مذاق اور شگفتہ ذوق کے مالک تھے۔ جب وہ کانپور جمعیت علماء کے صدر تھے اور ان کے خصوصی معاون و معتمد مولانا انوار احمد جامعہ ناظم تھے۔ اور ان دونوں حضرات کی مشہور جوڑی نے اپنے ساتھ کانپور کے متعدد متحرک و با حوصلہ افراد کو بھی جوڑ لیا تھا۔ وہ ایک دور تھا جب جمعیت علماء کی ضلعی ہی نہیں بیشتر صوبائی شاخوں سے کہیں زیادہ کانپور جمعیت علماء سرگرم عمل تھی جس میں ”جمعیت ہسپتال“ کے قیام اور اس کے ذریعہ انجام پانے والی خدمات کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ کانپور کے بیشتر علماء کے استاذ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب کا بھی قیام کانپور ہی میں تھا جن کی ان حضرات کو سرپرستی حاصل تھی۔ جمعیت علماء کا صوبائی دفتر یوپی کی راجدھانی لکھنؤ ہی میں تھا اور لکھنؤ کی ضلعی یونٹ بھی تھی مگر حقیقت یہ ہے کہ جس آب و تاب کے ساتھ ان دنوں جمعیت کی کانپور یونٹ سرگرم عمل تھی اور اپنی ملی خدمات کی وجہ سے جو اعتبار و اعتماد کا مقام اسے حاصل تھا وہ لکھنؤ یونٹ کو حاصل نہ تھا۔ میرے والد ماجد حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب فاروقی کا، خود میرا اور میرے استاذ محترم حضرت مولانا قاری محمد صدیق صاحب لکھنؤی کا کانپور اور علمائے کانپور سے مضبوط رشتہ تھا اور برابر آنا جانا لگا رہتا تھا، خصوصاً استاذ مرحوم حضرت قاری محمد صدیق صاحب لکھنؤی کا تو کانپور اور اہل کانپور سے اتنا مضبوط و مستحکم رشتہ تھا کہ ہر چھوٹے بڑے دینی و اصلاحی جلسہ میں قاری صاحب کی حاضری مقامی علماء سے بھی زیادہ ضروری و لازمی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ شاید ہی کوئی ہفتہ خالی جاتا ہو جس میں کسی نہ کسی مناسبت سے حضرت قاری صاحب کا کانپور جانا نہ ہوتا ہو۔

یہ وہ ماحول تھا جس میں مولانا اسامہ قاسمی کی تعلیم و تربیت ہوئی، پھر اس پر مستزاد قدرت کی طرف سے ودیعت کی گئی ان کی اپنی ذاتی صلاحیتیں و سعادتیں؟۔

چونکہ مولانا اسامہ مرحوم کے والد ماجد حضرت مولانا مبین الحق صاحب میرے پھوپھا مولانا رفیق القاسمی صاحب مدظلہ کے ہم سبق ساتھی تھے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ مولانا مبین الحق صاحب نے دارالعلوم دیوبند سے سند فضیلت حاصل کرنے کے بعد ایک عرصہ دارالمبلغین لکھنؤ کے شعبہ مناظرہ میں ایک طالب علم کی حیثیت سے بھی گزارا جہاں حضرت امام اہلسنت کی سرپرستی میں ان کے خصوصی استاذ میرے عم محترم حضرت مولانا عبدالسلام صاحب تھے۔ میرے والد ماجد صاحب کا بھی اس وقت دارالمبلغین سے بہت سرگرم رشتہ تھا، پھر میرے گھر کی دیوار دارالمبلغین سے بالکل متصل تھی۔ ان سب کے علاوہ کچھ دوری و نزدیکی رشتہ داریاں و قرابتیں بھی تھیں۔ ان سب وجوہات سے مولانا مبین الحق صاحب مرحوم سے میرا بہت کم سنی ہی سے بے لوث و پر خلوص رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ یہی سبب ہے کہ کانپور شہر کے مرکزی جلسہ سیرت النبی و سیرت صحابہ میں بحیثیت مقرر میری شرکت عنفوان شباب ہی سے ہونے لگی۔ اس کے علاوہ مولانا مرحوم کانپور میں اپنے حلقہ اثر کے متعدد جلسوں میں بھی بحیثیت مقرر مجھے سال میں کئی مرتبہ بلواتے تھے۔ عموماً ہر چھوٹے بڑے جلسہ کی نظامت مولانا مبین الحق صاحب ہی کرتے تھے جس کا انہیں خصوصی سلیقہ حاصل تھا۔ ان کی بھرپور اور پر موقع اشعار سے مرصع نظامت مجمع میں بیداری پیدا کر دیا کرتی تھی..... یاد ہے کہ ان دنوں ہمارے مولانا اسامہ قاسمی مرحوم ایک کمسن خوب رو اور خوش پوش بچہ کی حیثیت سے ایچ پراپنے والد ماجد کے اغل بغل موجود رہا کرتے تھے۔ کبھی کسی جلسہ میں ان کی تلاوت بھی ہو جایا کرتی

تھی۔ بڑی محبت اپنائیت اور پر تپاک انداز میں پورے احترام کے ساتھ ملا کرتے تھے..... اور یہ ان کی وضعداری، نیک آثاری اور ”شربار شجر“ ہونے ہی کی بات ہے کہ ملنے ملانے اور گفتگو کرنے کا جواز انہوں نے اپنے بڑوں سے سیکھ کر بچپن میں اپنایا تھا، اس کا پاس و لحاظ انہوں نے اس دنیائے فانی کی آخری ملاقات تک باقی رکھا۔ فرحمة الله عليه رحمة واسعة اب اداس و مغموم دل کی صدا ہے کہ

تم سے ملنا خوشی کی بات سہی ☆ تم سے مل کر اداس رہتا ہوں

یہ تو ہوئی مولانا مرحوم سے ذاتی رشتوں و محبتوں کی بات..... جہاں تک ان کی علمی، اصلاحی و ملی خدمات اور ان کی اچانک رحلت سے پہونچنے والے نقصان کا معاملہ ہے، تو اس پر پورے ملک کے نہ صرف علماء و اہل مدارس، بلکہ دیگر حلقوں کی طرف سے بھی تادم تحریر مسلسل اظہارِ بے چینی و بیقراری کیا جا رہا ہے اور بارگاہِ الہی میں ان کی مغفرت و بلندی درجات کے ساتھ ساتھ ان کے نعم البدل کے طور پر ان جیسا مخلص، بے باک اور بے لوث رہنما میسر آنے کے لئے دعائیں کی جا رہی ہیں، اس کے بعد اب مزید کچھ رقم کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی ہے..... اس حوالہ سے مولانا اسامہ کی ملی خدمات اور ان کی ہر دلعزیزی کے اظہار کے لئے اس واقعہ کا ذکر کر دینا بھی مناسب ہوگا کہ کانپور میں ایک دوسرے مکتب فکر کے قاضی شہر کو صرف اس لئے ”زیر عتاب“ ہونا پڑ گیا کہ موصوف قاضی شہر صاحب نے اپنے ایک اخباری بیان میں مولانا اسامہ مرحوم کی تعزیت کرتے ہوئے ان کی وفات کو ملی خسارہ قرار دینے کا جرم کیا تھا..... اس جرم کی سزا میں ان ہی کے ہم مسلک کسی مفتی صاحب نے (جن کا نام اس سلسلہ کی آڈیو سے نہیں معلوم ہو سکا) نہ صرف قاضی صاحب کی تکفیر کر دی بلکہ انہیں تجرید ایمان، تجرید نکاح، تجرید بیعت اور نہ جانے کن کن

چیزوں کی تجدید کا حکم صادر فرماتے ہوئے اپنی طرف سے انہیں قاضی کے منصب سے تا تو بہ معزول کر کے اپنے ہم مسلک لوگوں کو اپنے فتویٰ پر عمل کرنے کی تلقین بھی کر دی ہے؟

مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کافر و مشرک کی موت پر اظہارِ تعزیت کیا جائے، اس کے اچھے اخلاق اور اچھے کاموں کے حوالہ سے رنج و غم کا اظہار کیا جائے تو دین و ایمان اور نکاح و بیعت وغیرہ پر کوئی حرف نہیں آئے گا..... لیکن مولانا اسامہ قاسمی کی تعزیت کرتے ہوئے ان کے اخلاق کریمانہ کا ذکر اور ان کی خدمات کے حوالہ سے ان کی وفات کو ملی خسارہ قرار دے دیا جائے تو منصبِ قاضی کے ساتھ ہی ایمان، بیعت اور بیوی سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔

وہ کافر نگاہیں خدا کی پناہ ☆ جدھر پھر گئیں فیصلہ ہو گیا

ہم تو نہ صرف موصوف قاضی صاحب بلکہ ان پر کفر کا فتویٰ صادر کرنے والے ”مفتی“ صاحب کے بیانات کو بھی مولانا اسامہ مرحوم کے لیے فال نیک قرار دیتے ہوئے یہی کہتے ہیں کہ یہ مولانا مرحوم کے ایمان صادق، اخلاص نیت اور جہدِ پیہم کی ہی سکہ گری ہے کہ ایک طرف ان کا ”مسلکی مخالف“ بھی ان کی تعریف و تحسین پر مجبور ہوا۔ دوسری طرف ان کی وفات سے ”سہم ہوئے شکاروں“ کو کھیل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ اور وہ ”مذہبی حرکتوں“ پر مجبور ہو گیا۔

فیاحسرتا علی العباد۔

جہاں تک مولانا اسامہ مرحوم کا معاملہ ہے تو وہ اب اپنے اس رب کے حضور پہنچ چکے جو رحیم و کریم ہونے کے ساتھ ہی علام الغیوب اور دلوں کا حال جاننے والا اور نیک و بد کی جزا و سزا پر پوری قدرت رکھنے والا ہے..... اس لیے ہم اسی کے سامنے اپنا دامن پسارے دعا گو ہیں کہ اے رب کریم آپ اپنے اس ناتواں و کمزور بندہ اسامہ قاسمی کے ساتھ اپنے شایانِ رحمت معاملہ

فرما کر اس کی مغفرت کاملہ فرمادے۔ اس کی حسنات کا بہترین صلہ عطا فرمادے اور اس کی سیأت کو محض اپنے کرم سے معاف فرما کر اپنے مقرب بندوں میں انہیں شامل کر لے۔ ان کے ورثا و پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرما اور ملت اسلامیہ کو ان کا نعم البدل عطا فرما۔ وما ذلک عولیٰ اللہ بعزیزہ

مولانا اسامہ مرحوم تو یہ کہتے ہوئے ہماری اس فانی دنیا سے رخصت ہو گئے کہ

سورج ہوں زندگی کی رمت چھوڑ جاؤں گا

میں ڈوب بھی گیا تو شفق چھوڑ جاؤں گا

***** ❁ *****

میرے حفیظ بھائی جان

۸ اگست ۲۰۲۰ء کو ہفتہ واری ”لاک ڈاؤن“ کے دو دنوں میں کا پہلا دن بیزاری اور اکتاہٹ کے ساتھ جیسے تیسے گزر چکا تھا کہ نماز مغرب سے کچھ پہلے اس اندوہناک اور غیر متوقع خبر نے سارے وجود کو ہلا کر رکھ دیا کہ ابھی کچھ دیر ہی پہلے بارہ بنکی میں میرے خوش گفتار، خوش اطوار اور ہر دل عزیز بہنوئی الحاج محمد حفیظ اللہ صاحب نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

چند برس پہلے دل کی بائی پاس سرجری کے بعد سے ان کی علالت کا کچھ نہ کچھ سلسلہ تو چل رہا تھا۔ پھر ۷/۸ برس کی عمر میں ضعف و پیرانہ سالی کی وجہ سے بھی ان کے اندر پہلے جیسی چستی و پھرتی بھی نہیں رہی تھی، اس کے باوجود مزاج کی شگفتگی اور انداز گفتگو کی چاشنی برقرار تھی۔ نماز، روزہ اور معمولات یومیہ کو تو اپنے گھر ہی میں رہ کر کسی نہ کسی طرح انجام دے لیتے لیکن سفر سے ہمت جواب دے چکی تھی۔ ہر ٹیلی فونی گفتگو میں جلد ہی لکھنؤ آنے کا وعدہ ضرور کرتے، مگر کم و بیش دو برس کے عرصہ سے نہ وہ لکھنؤ آ سکے نہ ہی میں اپنے ضعف و علالت خصوصاً گھٹنوں میں درد کی معذوری کی وجہ سے اس دوران بارہ بنکی جاسکا — اس طرح دونوں جانب سے شدید خواہش و چاہت کے باوجود ایک طویل عرصہ سے ہماری ملاقات بھی نہیں ہو سکی تھی۔ بس فون ہی پر کبھی مختصر اور کبھی طویل گفتگو کے ذریعہ ہم اپنی اپنی تسلی کا کچھ سامان کر لیا کرتے۔ اسی

معمول کے مطابق دو تین روز قبل ہی فون پر اچھی خاصی تفصیلی گفتگو ہوئی تھی جس میں انہوں نے ”کرونا“ کی بڑھتی ہوئی وبا اور پھر ”لاک ڈاؤن“ پر اظہار بیزاری و افسوس کرتے ہوئے مقدس ماہ رمضان، عید الفطر، اور اب عید الاضحیٰ کی نمازوں کے لئے مسجد کی باجماعت نماز سے محرومی پر اپنے رنج و قلق کا اظہار کرتے ہوئے رمضان کے مکمل روزوں اور عید الاضحیٰ کی قربانی کی ادائیگی پر اظہار شکر و مسرت بھی کیا تھا۔

وہ مجھ سے عمر میں کئی برس بڑے اور مجھ سے کہیں زیادہ معذور ہو چکے تھے، اس لئے میں نے خود کئی مرتبہ بارہ بنکی جا کر ان سے ملاقات کرنے کا پروگرام بنایا، اور ابھی کچھ عرصہ پہلے تو انہیں اپنی بارہ بنکی پہنچنے کی تاریخ کی بھی اطلاع دے دی تھی، مگر اللہ تعالیٰ کو یہ ملاقات منظور نہ تھی، میری پیٹ کی تکالیف و دیگر امراض کا عین وقت پر ایسا سلسلہ شروع ہو گیا کہ ۱۵-۲۰ روز تک میں مسجد بھی نہیں جاسکا — اس لئے میرا اور میرے مرحوم بہنوئی دونوں کا انتظار بس انتظار ہی رہ گیا اور ملاقات نہ ہو سکی۔ سچ ہے کہ

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش یہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارماں، پھر بھی کم نکلے

میرے مرحوم بہنوئی صاحب نے امراض اور ان کی تکلیفیں تو بہت ہی صبر و ضبط اور کسی شکوہ و شکایت کے بغیر برسوں جھیلیں، لیکن جب دم واپس آ یا تو شدید قلبی دورہ کے نتیجہ میں کسی علاج و معالجہ کے بغیر بس ۵-۷ منٹ کے اندر اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔ ع

کتنی مشکل زندگی ہے کتنی آساں ہے موت

مرحوم کے والد جناب محمد حمید اللہ صاحب مرحوم میرے والد ماجد کے حقیقی پھوپھی زاد بھائی تھے اور دونوں بھائیوں کے درمیان بھی خلوص و اعتماد کا بہت مضبوط رشتہ تھا۔ اس طرح وہ میرے چچا زاد بھائی بھی تھے اور انہوں نے

میرے گھر میں رہ کر لکھنؤ یونیورسٹی سے تعلیم بھی حاصل کی تھی، اگرچہ رشتہ طے ہونے کے بعد وہ میرے گھر سے ہٹ کر لکھنؤ کے ایک محلہ ڈالی گنج میں ایک کرایہ کے کمرہ میں چلے گئے تھے اور وہیں رہتے ہوئے انہوں نے علم معاشرت (سوشیالوجی) میں ایم۔ اے کیا تھا۔ پھر کچھ عرصہ سنی انٹر کالج میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد وہ یوپی کے محکمہ صحت میں ”ہیلتھ ایجوکیشن افسر“ کے عہدہ پر ملازم ہو گئے تھے، اور اس ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ہمیشہ صاحبہ کے ہمراہ انہوں نے حج بیت اللہ کی سعادت بھی حاصل کی تھی۔

بہت ہی ملنسار، ہنس مکھ، اور مرنجاں مرنج شخصیت کے حامل تھے۔ خاندان کے ایک ایک گھر اور ایک ایک فرد سے وہ جس طرح رابطہ میں رہ کر ہر خوشی و غم میں شریک رہتے اس کی مثالیں کم ہی مل پاتی ہیں۔ ان کا حلقہ احباب بھی کافی وسیع تھا۔ اسی لئے ”لاک ڈاؤن“ کی پابندیوں کے باوجود ان کی نماز جنازہ اور تدفین میں جتنی بڑی تعداد میں لوگ شریک ہوئے، موجودہ ماحول میں اس کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ لکھنؤ بارہ بنکی کے اعزہ و احباب کے ساتھ ہی ان کی تدفین کے وقت قبرستان پہنچنے اور پھر تعزیت کے لئے آنے والوں میں مسلمانوں کے ساتھ ہی بڑی تعداد میں بارہ بنکی کے غیر مسلم انسانیت دوست حضرات بھی شامل تھے، جن میں اہم سیاسی، ادبی و سماجی حیثیت کے حامل افراد بھی تھے۔ اور یہ سب کچھ ان کے حسن اخلاق، وضع داری اور ہر دل عزیز کی وجہ سے ہوا۔

ہمارے دین اسلام میں حقوق اللہ ہی کی طرح حقوق العباد کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے، اور حق تعالیٰ کا یہ واضح مینی برانصاف فیصلہ ہے کہ بندہ جس کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کرے گا، اس کا انتقام لینے یا معاف کرنے کا اختیار بھی صاحب حق ہی کو حاصل ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں اسی بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ”عبادات“ بندوں اور ان کے خالق کے درمیان کی چیز ہے،

جب کہ ”معاملات“ بندوں کے آپسی رشتوں و تعلقات سے وابستہ چیز ہے۔ اسی لئے ”عبادات اور حقوق اللہ“ سے کہیں زیادہ پرخطر اور لائق فکر و لحاظ چیز ”معاملات کی درستگی اور حقوق العباد کی ادائیگی“ ہے۔ کیوں کہ ہمارا خالق و مالک پروردگار رحم الراحمین اور اپنے نافرمان و کوتاہ بندوں کو معاف کرنے اور معاف کر دینے کو پسند کرنے والا ہے، جب کہ بندے نہ اتنے بے نیاز ہو سکتے ہیں نہ ہی اتنے وسیع القلب اور سخی ہو سکتے ہیں اور احکم الحاکمین کے فیصلہ کے مطابق بندے جب تک اپنے ساتھ ہونے والی حق تلفیوں اور معاملات کی کوتاہیوں و اذیتوں کو خود ہی معاف نہیں کریں گے بندوں کا خالق و مالک اور احکم الحاکمین بھی معاف نہیں کرے گا اور مظلوم و مقہور بندوں کے مطالبہ پر ظالموں و قاتلوں سے انہیں پورا پورا بدلہ و انتقام دلانے کا — عموماً راقم الحروف اور اس جیسے کوتاہ فہم اور عاقبت نااندیش بندے ”معاملات و حقوق العباد“ کی درستگی و ادائیگی کی طرف اس قدر توجہ نہیں کرتے جس قدر ہونا چاہئے۔ یقیناً با توفیق اور لائق صد تحسین ہوتے ہیں وہ بندے جو عبادات ہی کی طرح معاملات، اور حقوق اللہ ہی کی طرح حقوق العباد کا بھی پاس و لحاظ رکھتے ہیں — اپنے تجربہ و مشاہدہ کی بنیاد پر راقم الحروف یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کے بہنوئی محمد حفیظ اللہ صاحب مرحوم بھی اپنی بساط کی حد تک ایسے با توفیق و لائق ذکر بندوں میں شامل تھے۔ و ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

سخاوت، غرباء پروری، مہمان نوازی، اور اپنے خاندان و کنبہ سے لے کر اپنے محلہ اور تمام اہل تعلق کے مفلوک الحال لوگوں کی خبر گیری و دستگیری ان کا محبوب مشغلہ تھا جس کے ذریعہ وہ سکون قلب حاصل کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اس طرح اچانک موت پر آنسو بہانے اور ان سے وابستہ اپنی یادوں کو بیان کرنے والوں میں کئی ایسے خواتین و مرد بھی شامل تھے جو ان کی سخاوت و خدا ترسی سے فیض یاب ہوئے تھے۔

موت ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جس کا انکار وہ لوگ بھی نہیں کر پاتے جو خدا کے وجود تک کا انکار کرنے کی جسارت کر لیتے ہیں؟۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اپنا عزیز و چہیتا کتنا ہی طویل العمر ہو جائے، خود وہ بھی اور اس کے چاہنے والے بھی عام حالات میں نہ موت پر خوش اور راضی رہتے ہیں، نہ اس فانی دنیا کی حیات مستعار کا وقفہ بڑھانے کی طلب کو چھوڑتے ہیں۔ تاہم جو باتو فیق بندے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت حیات میں اپنی ذات اور اپنے کنبہ کی حدود سے باہر نکل کر دوسروں کا بھی کچھ حق سمجھتے ہوئے اس کی ادائیگی کے لئے اپنے اخلاق و کردار اور حسبِ توفیق ایثار و قربانی کے ذریعہ قلبی سکون کا سامان فراہم کرتے ہیں، وہ صحیح معنی میں اپنے ”انسان“ ہونے کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اور اپنے پروردگار کو خوش کرنے کے ساتھ ہی وہ بندوں کے محبوب بھی بن جایا کرتے ہیں۔ ان کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد کسی مطالبہ و فرمائش کے بغیر لوگ ان کی خوبیوں اور ان کی ذات سے ہونے والی منفعتوں کا ذکر کر کے بے ساختہ ان کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ اسی بات کو شاعر نے یوں کہا ہے کہ۔

موت اس کی ہے کرے جس پہ زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لئے

ہمارے مرحوم بہنوئی صاحب اپنی دلچسپ گفتگو، مہمانوں کی آمد پر خوش ہو کر ان کے سامنے بچہ بچہ جانے کے انداز، مفلوک الحال و بے سہارا لوگوں کی خاموشی کے ساتھ مدد و امداد، اور بچوں کے ساتھ کافی کافی دیر تک ”بچہ بن کر“ ان کے کھیل کود میں شریک ہو جانے جیسی بہ ظاہر چھوٹی چھوٹی اداؤں یا عادتوں کے ذریعہ ایسے ہر دل عزیز اور محبوب تھے کہ بچہ سے لے کر بوڑھا تک ہر ایک ان کی اس طرح جدائی پر مغموم و اشک فشاں ہو گیا۔

وہ نہ ادیب تھے، نہ شاعر، مگر ان کا ذوق ادیبانہ و شاعرانہ تھا۔ اردو سے

ان کا رسمی رشتہ ”مادری زبان“ کی حد تک ہی تھا۔ انہوں نے اپنی مادری زبان اردو میں نہ کوئی قابل ذکر سند حاصل کی تھی، نہ ہی ان کی سرکاری ملازمت کے کام کاج میں اردو زبان کا کوئی دخل تھا۔ اس کے باوجود کچھ گھریلو ماحول اور اس سے بڑھ کر فطری ذوق کی وجہ سے وہ ”اچھے خاصے اردو والے“ معلوم ہوتے تھے۔ تعلیم سے لے کر ملازمت تک کا بیشتر حصہ اردو مخالف یا کم از کم ”اردو بیزار“ ماحول میں گزارنے کے باوجود انہیں اردو زبان اور ”اردو تہذیب“ سے ایسی گہری مناسبت تھی کہ انہوں نے ہمیشہ اردو اخبار ہی پڑھا اور اردو زبان میں لکھی گئی کتابوں کے مطالعہ سے ہی شغف رکھا۔ کبھی جب اردو ادیبوں و شاعروں کی کسی مجلس میں ہم نشین ہونے کا موقع مل جاتا تو اپنے لطیفوں اور بر محل اشعار کے ذریعہ ”خالص اردو والوں“ کو بھی اپنی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دیا کرتے تھے۔ سرکاری ملازمت سے سبکدوشی، خصوصاً حج کی سعادت حاصل کر لینے کے بعد سے افسانوں، ناولوں اور ادبی کتابوں کے بجائے دینی و اسلامی موضوعات کی کتابوں کے مطالعہ کا شوق غالب ہو گیا تھا۔ میرے رسالہ ”البدر“ کا مطالعہ بہت ہی شوق اور پابندی کے ساتھ کرتے۔ اس میں کچھ پسند آتا تو ملاقات پر یا پھر فون ہی پر اپنی پسندیدگی و مسرت کا اظہار کرتے، اور کبھی نظام ڈاک کی خرابی کی وجہ سے رسالہ ملنے میں تاخیر ہوتی تو اس کا تقاضا کرتے۔ اسی طرح جب تک لکھنؤ میں میرے گھر آنے جانے کے قابل رہے تو واپس جاتے ہوئے اکثر میرے پاس سے اپنی منتخب دینی کتابیں مطالعہ کے لئے ضرور لے جاتے، جب لکھنؤ کی آمد و رفت کم، محدود یا بالکل ختم ہو گئی تب بھی ان کا ذوق مطالعہ برقرار رہا۔ اور اکثر ایسا ہوتا کہ فون پر مجھ سے کتابیں بھیجنے کا مطالبہ کرتے، اور میں بارہ بٹکی جانے والے اپنے کنبہ کے کسی فرد کے ذریعہ کتابیں بھیج کر ان کی فرمائش پوری کر دیا کرتا۔ ابھی وفات سے کم و بیش ایک ماہ قبل ہی میرے بھانجے عبدالصبور سلمہ لکھنؤ آ رہے تھے تو ان کو بھیج کر مجھ سے کچھ

کتابیں منگوائی تھیں۔ مگر بعد کی ٹیلی فونی گفتگو سے یہ علم ہوا تھا کچھ اپنی علالت و نقاہت، اور کچھ ”لاک ڈاؤن“ کے بیزار کن نفسیاتی اثر کی وجہ سے وہ بالاستیعاب ان کتابوں کا مطالعہ نہیں کر سکتے تھے۔

ان کی اردو دوستی، علم پروری اور خرد نوازی کا یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ جن دنوں وہ میرے گھر میں رہ کر تعلیم حاصل کر رہے تھے، میں بہت کم عمر اور حفظ قرآن کرنے والا ایک بچہ تھا۔ اپنے مدرسہ کے باہر بلکہ اپنے حافظہ جی سے چھپ چھپا کر لکھنے پڑھنے کی کچھ مشق اپنی ہمیشہ (جو بعد میں مرحوم کے عقد نکاح میں آکر ان کی شریک حیات بنیں) کے ساتھ گھر میں بیٹھ کر کر لیا کرتا تھا، جو ان دنوں میرے مدرسہ تجوید الفرقان کی نسواں شاخ میں تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ اس طرح مجھے کچھ اردو لکھنا پڑھنا آ گیا تھا۔ میرے مرحوم بھائی (اس وقت وہ صرف میرے چچا زاد بھائی ہی تھے) نے میرے اردو لکھنے پڑھنے کے ”خارجی ذوق و دلچسپی“ کو دیکھ کر میرے والدین کی اجازت سے جامعہ اردو علی گڑھ کے مراسلاتی امتحان ”ادیب“ کا فارم بھر وادیا، اور اس امتحان کی ضروری کتابیں بھی لے آئے۔ یہ امتحان اچھا خاصا معیاری ہوتا تھا، جو ظاہر ہے کہ میری اس وقت کی لیاقت کے اعتبار سے میرے بس کا نہیں تھا۔ کتابیں دیکھ کر میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہہ دیا کہ میں یہ امتحان نہیں دے سکتا ہوں۔ مگر مرحوم نے میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے مجھ سے کہا کہ امتحان کا فارم میں نے بھروایا ہے تو تیاری بھی میں ہی کراؤں گا۔ امتحان کئی ماہ بعد ہونا تھا، اور اس دوران وہ جی جان سے مجھے امتحان کی تیاری کرانے میں جٹ گئے۔ نثر و نظم کی کتابوں کی مشکلات تو ان کے ساتھ والد صاحب مرحوم بھی حل کر دیا کرتے تھے۔ لیکن کئی کئی صفحے اردو لکھنے کی مشق، نقل و املا دونوں طریقے پر مرحوم بھائی ہی کراتے تھے۔ اور پھر اس محنت و جاں فشانی کا ثمرہ یوں ظاہر ہوا کہ میں نے ”ادیب“ امتحان سیکنڈ ڈویژن کے ساتھ پاس کر لیا۔

کم عمری کے اس پہلے امتحان کی کامیابی نے مجھے جو مسرت و اعتماد عطا کیا اس نے میرے اندر امتحانات دے کر کامیابی حاصل کرنے کا ایک چسکہ ڈال دیا۔ پھر تو میں نے دوران طالب علمی ہی میں جامعہ اردو علی گڑھ، جامعہ دینیات اردو دیوبند، اور اتر پردیش عربی و فارسی بورڈ الہ آباد کے متعدد امتحانات میں شامل ہو کر کامیابیاں حاصل کر لیں۔ اور یہی وہ چسکہ تھا کہ تعلیم سے ”رسمی فراغت“ اور باقاعدہ پیشہ تدریسی سے وابستہ ہو جانے کے بعد بھی ۱۶-۱۷ برس تک میں پرائیویٹ طور پر عصری جامعات کے امتحانات دے کر کامیابیاں حاصل کرتا رہا، اور بفضل خدا میرے پاس سندرات و ڈگریوں کی اچھی خاصی تعداد جمع ہو گئی۔ اب اسے کیوں کر فراموش کر سکتا ہوں کہ میری مدرسہ کی تعلیم سے الگ ہٹ کر پہلا امتحان دلوانے کا کام ”میرے حفیظ بھائی جان“ ہی نے کرایا تھا؟۔

قانون قدرت کے مطابق حفیظ بھائی جان بھی دنیا کی حیات مستعار کی میعاد پوری کر کے راہی ملک بقا ہوئے۔ وہ ہماری اس دنیا میں شمار کئے جانے والے ”اعزازات“ میں سے کسی ایسے ”ظاہری اعزاز“ کے حامل نہ تھے کہ مبالغہ آرائی کر کے بھی ان کی وفات کو ”ملک و ملت کا بڑا خسارہ“ قرار دیا جاسکے۔ تاہم وہ اپنے اہل و عیال ہی نہیں، اپنے تمام وابستگان کے لئے اپنی وضع داری و ملنساری، خوش اخلاقی و خوش کرداری، اور دوسروں کو خوش کر کے خود خوش رہنے کی خصوصی ادا کی وجہ سے واقعی ایسے ”قیمتی“ تھے کہ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ۔

دیر و حرم میں روشنی شمس و قمر سے ہو نہ ہو

مجھ کو تو تم پسند ہو، اپنی پسند کو کیا کہوں

حق تعالیٰ اپنے فضل خاص سے ان کی مغفرت کاملہ فرمائے اور ان کے جملہ

ورثاء و پسماندگان خصوصاً میری ہمیشہ صاحبہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)۔

مولانا محمد عرفان قاسمی

بعض لوگ دل کے نہاں خانہ میں اتنی آہستگی اور سبک خرامی کے ساتھ ڈیرہ جماتے ہیں کہ کافی کافی مدت گزر جانے کے بعد بھی ان کے وجود کا احساس نہیں ہو پاتا۔ ہم ان سے ملتے جلتے اور ہنستے بولتے ہیں لیکن اس احساس کے بغیر کہ یہ اپنے دل کے اندر سمائے ہوئے ہیں — پھر کوئی خوشگوار یا ناخوشگوار لمحہ ایسا آتا ہے کہ جب وہ اپنے قرب کا احساس دلاتے ہیں تو ہم چونک جاتے ہیں، اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اپنی ”نادانستہ غفلت“ پر اپنا ہی دل ملامت کرتا ہے تو کف افسوس ملنے کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

۶ جون ۲۰۲۰ء کی شب میں میرے بہت ہی مخلص اور قدیم شاگرد مولانا محمد اکرم قاسمی کا فون آیا۔ وہ کاکوری کے قریب موضع منڈولی میں رہتے ہیں اور ان سے فون پر برابر بات ہوتی رہتی ہے۔ یوں گا ہے بگا ہے ان سے تعلق اور رشتہ کی بنیاد پر ملاقاتیں بھی ہوا کرتی ہیں — لیکن ۲۴ مارچ ۲۰۲۰ء سے ملک میں شروع ہونے والے ”لاک ڈاؤن“ کے دوران ملاقات نہ ہو سکنے کی وجہ سے فون کے ذریعہ بات چیت کچھ زیادہ ہی ہوتی رہی۔ ۶ جون کے اس فون پر علیک سلیک کی ابتدائی گفتگو کے بعد جوں ہی انہوں نے اپنے ہم سبق سنا بھی اور بے تکلف دوست مولانا محمد عرفان قاسمی کے بارے میں مجھ سے پوچھا

کہ عرفان کا تب کے سلسلہ میں آپ کو کچھ پتہ چلا؟ تو میں نے چونک کر انہیں جواب دیا کہ نہیں — اور پھر انہوں نے کچھ یوں تفصیل بیان کی کہ کل ۵ جون کو ان کے موبائل پر ایک مسیج آیا کہ ”مولانا عرفان قاسمی“ کا آج ممبئی میں (جہاں وہ عرصہ دراز سے اپنے اہل و عیال کے ساتھ سکونت اختیار کئے ہوئے تھے) انتقال ہو گیا اور ان کی وہیں تدفین بھی ہو گئی۔ مولانا محمد اکرم کے بیان کے مطابق انہیں اس مسیج پر پوری طرح یقین اس لئے نہیں آیا کہ جس نمبر سے یہ مسیج آیا تھا وہ ان کی ہمشیرہ کے نام سے محفوظ تھا۔ انہوں نے فوراً ہی پلٹ کر اسی نمبر پر فون کر کے بات کرنا چاہی تو فون ریسپونڈ نہیں کیا گیا۔ تب انہوں نے اپنے دوسرے ہم سبق سنا بھی مولانا محمد شفیع قاسمی کو کاکوری فون کر کے اس خبر کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے بھی بس اس مسیج کے آنے کو بتایا، اور خبر کی تصدیق کے لئے مولانا عرفان قاسمی کے بیٹے ابوسعید سلمہ سے فون پر رابطہ نہ ہو سکنے کا بھی ذکر کیا۔ اتنی اطلاع ہی خبر پر یقین کر لینے کے لئے کافی تھی، تاہم ایک امید موہوم پر دھڑکتے دل کے ساتھ فوراً ہی مولانا عرفان قاسمی کے بیٹے ابوسعید سلمہ کو فون کیا تو انہوں نے خبر کی تصدیق کرتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ مولانا کے دونوں ساتھیوں کو مسیج میں نے ہی کیا تھا — چند روزہ علالت کا کچھ حال بتاتے ہوئے انہوں نے یہ بھی بتایا کہ صرف ایک ہفتہ پہلے تک وہ پوری طرح صحت مندر بہتے ہوئے اپنے معمولات کو انجام دے رہے تھے، مگر جب بستر پر پڑے تو دن بہ دن مرض کی شدت اور نقاہت میں اضافہ ہوتا گیا۔ لاک ڈاؤن کی وجہ سے ہسپتال میں داخل نہیں کیا جاسکا۔ بالآخر ۵ جون روز جمعہ کو علی الصباح وہ فانی دنیا سے کوچ کر گئے اور اسی دن ان کی تدفین بھی ہو گئی۔

انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مولانا عرفان قاسمی ایک خوش مزاج، خوش اخلاق اور وضعدار انسان تھے۔ ان کا وطن لکھنؤ کے قریب ضلع سینتا پور کا قصبہ پینتے پور تھا، لیکن ان کی عمر کا

بیشتر حصہ اپنے وطن پینتے پور سے زیادہ باہر ہی گذرا۔

۱۹۷۸ء میں دارالعلوم سے سند فضیلت حاصل کرنے کے بعد ایک طویل مدت تک حصول معاش کے لئے ان کا قیام لکھنؤ میں میرے مکان کے بالکل قریب رہا۔ دارالعلوم کے زمانہ قیام میں انہوں نے اس وقت کے شعبہ کتابت کے مایہ ناز استاذ منشی امتیاز احمد صاحب سے باقاعدہ فن کتابت سیکھ لیا تھا، اور پھر اسی کو انہوں نے اپنے لئے ذریعہ معاش بنایا۔ مشہور صحافی جمیل مہدی مرحوم کے اخبار ”عزائم“ کے ساتھ ہی وہ پرائیویٹ طور پر بھی متعدد رسائل و کتب کی کتابت کرتے تھے۔ ان کی کتابت کا ایک امتیاز یہ تھا کہ کتابت کے ساتھ ہی ڈیڑاٹن و طغرے بھی وہ اسی تیز رفتاری کے ساتھ بنا دیا کرتے تھے جس طرح کتابت کرتے تھے۔ عام طور پر باذوق حضرات اپنی کتابوں کے لوح کے صفحات اور ٹائٹل کے لئے ان ہی کا انتخاب کرتے تھے۔

میرے رسالہ ”البدر“ اور میری متعدد کتابوں مثلاً ”تعارف مذہب شیعہ“، ”عورت اور پردہ“ وغیرہ جیسی کئی کتابیں بھی ان ہی کی کتابت سے منظر عام پر آتی رہیں۔ پڑوسی ہونے کے ناطہ سہل الحصول ہونے کے علاوہ میرا ان سے ایک رشتہ یہ بھی تھا کہ وہ میرے بھانجے عبدالمنان قاسمی مرحوم کے بھی ہم سبق ساتھی اور بے تکلف دوست تھے، جن کا قیام ان دنوں میرے مکان سے متصل اپنی والدہ کے مکان ہی میں تھا۔ اس رشتہ کی رعایت سے وہ میرے ساتھ خصوصی احترام و اکرام کا معاملہ کرتے تھے۔ کاتبوں کے عام معمول کے مطابق جب وہ میرے کام میں ٹال مٹول کر کے وعدہ خلافی کرتے تو بسا اوقات میں عبدالمنان مرحوم والے خصوصی رشتہ کی رعایت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں جھڑکیاں دے کر بگڑ بھی جاتا تھا۔ مگر کیا مجال کہ مسکرا نے کے سوا انہوں نے کبھی ”مجھے دی ہوئی خصوصی رعایت“ واپس لے کر مجھ سے تلخ کلامی کی ہو یا میرے مسودہ واپس مانگنے پر واپس کر دیا ہو۔ بلکہ ہوتا تو یہ تھا کہ وہ مسکرا

مسکرا کر معذرت ہی کرتے رہتے۔ اور جلد سے جلد میرا کام پورا کرنے کا وعدہ کر کے مجھے اپنا ”عارضی غصہ“ واپس لینے پر مجبور کر دیا کرتے تھے۔ بھلے ہی وہ وعدہ بھی وفانہ ہو، لیکن وہ اپنے حسن اخلاق کے ذریعہ تعلقات کو تلخی سے تو بچا ہی لیتے تھے۔ میرے والد ماجد سے بھی وہ نہایت ہی احترام و عقیدت کے ساتھ ملا کرتے تھے۔ عبدالمنان مرحوم سے تو ان کی بے تکلفی کا یہ عالم تھا کہ کبھی کبھی موقع ملتے ہی وہ ان کا چشمہ اتار کر واپسی کے لئے چائے پلانے کی شرط لگا دیتے، اور اکثر وہ اپنی شرط میں کامیابی بھی حاصل کر لیا کرتے تھے۔

ہم لوگوں کی محبت و رعایت میں وہ ہمارے مدرسہ دارالعلوم فاروقیہ کا کوری میں سال میں دو ایک مرتبہ تو پہنچ ہی جایا کرتے تھے، جہاں عبدالمنان مرحوم کے علاوہ ان کے دوسرے ساتھی اور دوست مولانا محمد شفیع قاسمی تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے۔ کتابت ایک ایسا ”دیدہ ریزی“ کا پیشہ ہے کہ اس سے وابستہ لوگ دوستوں، یاروں، اور مجلسوں کے لئے وقت نہیں نکال پاتے۔ مگر مولانا عرفان قاسمی کا اس سلسلہ میں بھی جداگانہ طرز تھا۔ لکھنؤ میں ان کے دوست احباب کا وسیع حلقہ تھا جن سے ملنے ملانے کے لئے وہ باقاعدہ وقت نکال لیا کرتے۔ وہ دینی حلقوں اور مشاعروں وغیرہ میں بھی حسب ذوق شرکت کیا کرتے تھے۔ وہ عالموں میں عالم، شاعروں میں شاعر، اور دوستوں میں دوست تو باسانی بن جاتے تھے، لیکن اس کا اندازہ نہیں کہ وہ کاتبوں میں کاتب بھی بن پاتے تھے یا نہیں۔ ہاں راقم الحروف نے متعدد کاتبوں کو ان پر حسد کرتے ہوئے ضرور دیکھا ہے؟

مولانا عرفان قاسمی خوش اخلاق و خوش گفتار ہونے کے ساتھ ہی خوش پوش و خوش خوراک بھی تھے۔ میرے علم میں یہ بات تھی کہ ان کی کافی رقم خوش پوشی اور احباب کی ضیافت میں خرچ ہو جایا کرتی تھی۔ جب انہوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کی اور ان کے بڑھتے ہوئے کنبہ کی

کفالت ”لکھنؤ جیسا نازک اندام شہر“ نہیں کر سکتا تو انہوں نے عروس البلاد بمبئی کا رخ کیا اور کچھ عرصہ کے بعد وہ وہاں کے سب سے بڑے اردو اخبار ”انقلاب“ کے شعبہ کتابت سے ملازمت کے رشتہ کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ بمبئی میں انہوں نے خوب خوب نام، دام، اور عزت و اعزاز کمایا۔ ان کو ”خوش حالی“ میسر آئی تو اپنے بال بچوں کے ساتھ بمبئی ہی کے ہو گئے۔ اور وہاں کے علماء، شعراء، اور صحافیوں سے ان کے بہترین مراسم قائم ہو گئے۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ انہوں نے روزنامہ ”انقلاب“ کی ملازمت سے آزادی حاصل کر لی اور آزادانہ طور پر اپنے کاروبار میں لگ گئے۔ ان سب کے باوجود انہوں نے لکھنؤ اور اہل لکھنؤ سے اپنا رشتہ بنائے رکھا۔ مجھے بھی ہر خوش گوار و ناخوش گوار موقع پر فون کرنے کے ساتھ ہی یوں بھی یاد آ جانے پر فون پر رابطہ کرتے اور دیر تک بات کرتے۔ سال پیچھے اپنے وطن آتے تو اپنے لکھنؤ کے احباب کے لئے دو ایک دن کا وقت ضرور نکالتے۔ ۱۹۲۱ء میں میری والدہ ماجدہ کی وفات پر کئی مرتبہ وقفہ وقفہ سے فون کر کے اپنی پرانی یادوں کے حوالہ سے میری دل جوئی اور تعزیت کا سامان کرتے رہے۔

میرے بھانجے اور اپنے رفیق درس عبد المنان قاسمی کی طویل علالت اور پھر ان کی وفات پر تو بار بار فون کر کے اپنی تشویش اور فکر مندی کا اظہار کرتے رہے، اور اس سے میری ہمیشہ صاحبہ کو بھی باخبر کرنے کی تاکید کرتے رہے۔ ان کی علالت کے دوران ایک مرتبہ تو انہوں نے دبتے دبتے اور مجھے دل آزاری سے بچانے کے لئے لمبی تمہید کے بعد اپنی طرف سے ان کے علاج و معالجہ کے لئے مالی تعاون کی بھی پیشکش بہت اصرار کے ساتھ یہ کہتے ہوئے کی کہ آپ سب لوگ تو ماشاء اللہ وہاں موجود ہی ہیں۔ میرا بھی عبد المنان سے بہت گہرا رشتہ ہے، میں نے ان سے خوب خوب چھین جھپٹ کر کھایا ہے۔ اب میرے مالی حالات بھی اللہ کے فضل سے مستحکم ہیں، مجھے بھی اپنے

اس پیارے و مخلص دوست پر کچھ خرچ کرنے کا موقع دے دیجئے۔ اگرچہ ہم لوگ ان کی اس مخلصانہ پیشکش کو قبول نہیں کر سکے تھے، لیکن اس سے ان کے خلوص و محبت اور ہم سب لوگوں خصوصاً عبد المنان مرحوم کے تئیں دلی احساسات و جذبات کا پتہ ضرور چلا۔

کسی دینی و اصلاحی جلسہ میں شرکت کے لئے میری بمبئی حاضری کا انہیں علم ہو جاتا تو کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر مجھ سے ملاقات کے لئے ضرور پہنچتے۔ میرا جب تک محرم الحرام کے جلسوں کے لئے ہر سال بمبئی جانا ہوتا رہا تو میرے وہاں کے طویل قیام کے دوران میری قیام گاہ پٹھان باڑی، پیرولین میں کئی کئی مرتبہ ملاقات کے لئے بھی آتے اور میری تقریروں میں شرکت کر کے بہت محظوظ ہوتے۔

۱۹۹۵ء کے بعد سے میرا محرم کے ان جلسوں میں جانے کا سلسلہ بند ہو گیا۔ والد ماجد کے انتقال کے بعد میری ترجیحات و ضروریات بدل گئیں اور طویل عرصہ کے لئے میرا کاکوری و لکھنؤ چھوڑنا دشوار ہو گیا۔ اس لئے پیرولین کے ان جلسوں میں شرکت کا سلسلہ ختم ہو گیا، اگرچہ موقع بہ موقع دیگر پروگراموں میں شرکت کے لئے جانے آنے کا سلسلہ رہا۔ مگر قدیم اور اصل بمبئی کے اس سٹیج اور وہاں منعقد ہونے والے محرم کے اصلاحی جلسوں کی ایک خصوصی و تاریخی اہمیت رہی ہے۔ ہمارے اکابر علماء کے وہاں بیانات ہوئے۔ خود میرے خاندان میں میرے جد امجد، پھر میرے والد ماجد، اور پھر میرے مسلسل دس روزہ بیانات کا سلسلہ رہا۔ اور اللہ کے فضل و کرم سے یہاں کے بیانات و تقریروں کے ذریعہ اصلاح عقائد و اصلاح معاشرہ کا کام بڑے پیمانہ پر انجام پایا۔

میرا ان مجلسوں میں شرکت کے لئے ۱۵-۲۰ برس جانا ہوتا رہا۔ پھر جب میرے وہاں جانے کا سلسلہ موقوف ہوا تو کئی برسوں تک مختلف علمائے

کرام و مقررین عظام آتے رہے — اور پھر ایسا ہوا کہ یہ اہم تاریخی و اصلاحی جلسے کئی برسوں تک موقوف رہے۔ اس سلسلہ میں وہاں کے احباب مجھ سے بھی رابطہ کرتے رہے مگر کئی برسوں تک وہاں کے لئے کسی مقرر کا مستقل و مناسب انتظام نہ ہو سکا — پھر ادھر چند برس قبل کچھ مخلص احباب کے اصرار پر میرے فرزند ثانی مفتی حارث عبدالرحیم سلمہ کے بہ حیثیت مستقل مقرر وہ ذمہ داریاں انجام دینے کی بات ہو جانے کی وجہ سے ان کا ہر سال جانا ہو رہا ہے اور ماشاء اللہ انہوں نے بڑی حد تک علمی و خاندانی روایات کے تسلسل کو بنانے میں کامیابی حاصل کر لی ہے — گذشتہ سال کی بات ہے کہ عید الاضحیٰ کے بعد مولانا عرفان صاحب کا فون آیا اور انہوں نے مفتی حارث سلمہ کی تعریف کرتے ہوئے ان کے بارے میں کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ آپ کے بیٹے ہیں، جنہیں میں نے نہ دیکھا ہے نہ ملاقات کی ہے؟ میں نے جواب اثبات میں دیا تو انہوں نے تاکید کے ساتھ کہا کہ انشاء اللہ اس مرتبہ کی آمد پر ان سے ضرور ملاقات ہوگی۔ اور پھر میں نے دونوں کے فون نمبر بھی ان کی فرمائش پر ایک دوسرے کو دے دیئے۔ پھر چند ہفتہ کے بعد جب میرے فرزند مفتی حارث سلمہ ممبئی گئے تو مولانا عرفان قاسمی مرحوم نے بہت ہی اہتمام کے ساتھ ان سے ملاقات کی، اور اپنے دیرینہ رشتوں کے حوالہ سے اپنے خصوصی روابط پر دیر تک ”ایسی محبت آمیز و مشفقانہ گفتگو کی کہ حارث سلمہ بہت متاثر ہوئے۔ اور اس ملاقات کی اطلاع مجھے فون کے ذریعہ مفتی حارث اور مولانا عرفان مرحوم دونوں نے بڑی فرحت و شادمانی کے ساتھ کی۔

خلاصہ یہ کہ ایک پیکر اخلاص و محبت، اور تواضع و ایثار سے آراستہ، ہنستی مسکراتی اور سدا بہار شخصیت کا نام محمد عرفان قاسمی تھی۔ جن کی ۵ جون ۲۰۲۰ء کو اچانک اس دنیا سے رحلت ان کے اپنے کنبہ و پسماندگان ہی کی طرح ان کے احباب کو بھی بہت مغموم کر گئی، جن میں خود میں اور میرے ساتھ دیگر کئی ان کے

لکھنوی احباب بھی شامل ہیں۔ مرحوم تو مجھ سے فون پر کئی مرتبہ کہہ چکے تھے کہ میں جلدی لکھنؤ آنے والا ہوں اور آتے ہی اپنے مرحوم دوست عبدالمنان کی تعزیت کے لئے آپ کے اور ان کی والدہ صاحبہ کے پاس حاضری دوں گا — لیکن حقیقت یہی ہے کہ ع

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے نہ انہیں علم تھا نہ ہمیں علم تھا کہ ان کی لکھنؤ پہنچ کر ہم سب سے ملاقات کی یہ خواہش اب ایسی خواہش ہی رہے گی جو پوری نہ ہو سکے گی؟۔
حق تعالیٰ مرحوم کو اپنے قرب خاص میں جگہ مرحمت فرمائے اور ان کے اخلاف کو ان کی خوبیاں اپنانے کے توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین۔



میری باجی جان

۱۵ اکتوبر ۲۰۲۰ء کی صبح بھی بس معمول کے مطابق ہی تھی — لاک ڈاؤن اور ان لاک ڈاؤن کے طویل اور لایعنی چکر نے معمولات زندگی کو یکسر تبدیل کر دیا ہے۔ ”کرونا“ نامی بلا نے مدارس کی رونقیں چھین کر ہم مدرسہ والوں کو معطل و کاہل بنا دیا ہے۔ اب صبح کے چھوٹے موٹے کام تیزی کے ساتھ نمٹا کر وقت پر مدرسہ پہنچنے کی بھی کوئی جلدی نہیں ہوتی۔ صبح کے ناشتہ کے بعد بھی گھوم پھر کر اخبار یا کسی کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے لیٹ بیٹھ کر بس وقت کی اضاعت ہی ہو رہی ہے۔ اور کیفیت کچھ یہ ہے کہ —

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے ☆ عمریوں ہی تمام ہوتی ہے

باجی جان (میری سب سے بڑی بہن) کی چند روز سے علالت نے کچھ بے چینی بڑھا رکھی تھی۔ بہ ظاہر بیماری نہ کوئی نئی تھی نہ ہی تشویش ناک — لیکن ان کے کچھ بدلے بدلے معمولات اور کثرت کے ساتھ مختلف انداز میں موت کے ذکر نے ایک ناقابل بیان قسم کے اضطراب میں ضرور مبتلا کر رکھا تھا۔ ہمارے رہائشی مکانات بالکل متصل ہونے کے باوجود گھٹنوں کے درد کی وجہ سے ان کی بالائی منزل کی رہائش گاہ تک بار بار پہنچ تو نہیں پارہا تھا، لیکن فون کے ذریعہ ان کی خیریت برابر دریافت کر رہا تھا۔ ۱۴ اکتوبر کو رات گئے ان سے فون پر بات بھی ہوئی لیکن نفاہت کی وجہ سے وہ طویل گفتگو نہیں

کر سکی تھیں، البتہ مجھ سے اتنا ضرور کہا تھا کہ دعا کرو کہ نیند آجائے تو کچھ سکون ہو جائے گا۔ ۱۵ اکتوبر کو صبح ۸ بجے کے بعد فون پر ان کی خیریت دریافت کی تو ان کی بیٹی نے بڑی فرحت کے ساتھ بتایا کہ رات کو نیند بھی آگئی، صبح فجر کی نماز اطمینان کے ساتھ ادا کرنے، اور طلب کر کے چائے پینے کے بعد اب لیٹی ہیں تو آنکھ لگ گئی ہے۔ میں نے بھی مطمئن ہو کر اللہ کا شکر ادا کیا، اور لیٹے لیٹے اخبار پڑھتے ہوئے مجھے بھی جھپکی آگئی — ابھی ۹ اور ساڑھے نو بجے کا درمیانی وقت تھا کہ اپنے فرزند مفتی حارث سلمہ کی آواز پر میری آنکھ کھل گئی۔ انہوں نے ابھی اتنا بتایا ہی تھا کہ پھوپھی صاحبہ کی حالت اچانک بگڑ گئی ہے کہ اتنے میں چھوٹی بہن کے فرزند احمد میاں سلمہ گھبرائے ہوئے آئے اور انہوں نے بس اتنا ہی کہا کہ جلدی چلے، اور ان کے پیچھے پیچھے میں بھی ہانپتا کانپتا زینے چڑھ کر اپنی باجی جان کو دیکھنے پہنچا تو وہ ہماری اس فانی دنیا کو چھوڑ کر اتنی پرسکون تھیں کہ مجھ سمیت آس پاس موجود چھوٹے بڑے کسی کو بھی ان کے موت سے ہم آغوش ہونے کا یقین اس وقت تک نہیں ہوا جب تک ڈاکٹر نے اپنے مختلف آلات سے جانچ کر کے ان کی موت کی تصدیق نہیں کر دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

کتنی مشکل زندگی ہے کتنی آساں ہے موت

باجی جان میری تو سب سے بڑی حقیقی بہن تھیں، پھر اتفاق ایسا کہ ان کے شوہر محمد عرفان عالم صاحب مرحوم کی لکھنؤ ہی میں ملازمت ہونے، اور ہمارے رہائشی مکانات بالکل متصل ہونے کی وجہ سے پوری عمر ساتھ بھی رہا، اس لئے اس عمر میں کہ اب اپنی زندگی کے دن بھی گن گن کر گزارے جا رہے ہیں۔ ان کا ساتھ چھوٹا، اور گھر کے موجود افراد میں کسی نام لے کر پکارنے والے بڑے سے محروم ہو جانا، فطری طور پر باعث رنج و غم بنا ہوا ہے۔ اور کیفیت یہ ہے کہ اس سرائے فانی میں ان کی جدائی پر ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ

گذر جانے کے باوجود کوئی دن ایسا نہیں گذرا کہ جوان کی یادوں اور ان کی باتوں کے ذکر سے خالی گیا ہو؟۔ میں پوری دیانت داری کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ باجی جان کی زندگی میں مجھے ہرگز یہ احساس نہیں تھا کہ میری زندگی اور اس کے معمولات میں ان کی اتنی اہمیت ہے کہ ان کی جدائی کے بعد ان کی یادوں کو قلم بند کرنے کی کوشش کروں گا تو دل کی اداسی اور آنکھوں کے آنسو بار بار قلم کا راستہ روک لیں گے اور میں بے بس ہو کر قلم کا غنڈ پیٹ کر رکھتا رہوں گا؟۔ کئی مرتبہ کے اس آزمائشی مرحلہ سے گزرنے کے بعد آج پھر ہمت کی تویہ سوچ کر یک گونہ طمانیت ہوئی کہ میری باجی جان کی ہر دل عزیز کی ایسی ہے کہ انہیں بوڑھے سے لے کر بچے تک، اور اعزہ واقارب سے لے کر میل جول رکھنے والے بیرونی افراد تک، ہر ایک پیکر اخلاق و مروت اور شریک رنج و راحت قرار دینے پر مجبور سا نظر آ رہا ہے۔ حدیث نبوی کے مطابق خلق خدا میں یہ مقبولیت اور ذکر خیر خالق کی رحمت کو بھی متوجہ کر کے بشری خطاؤں و لغزشوں سے درگزر کئے جانے کا ذریعہ بن جایا کرتا ہے۔ اور ہمارے ارحم الراحمین خالق و مالک اللہ کو غیرت آتی ہے کہ اس کے کسی گنہگار بندے یا بندی کی اس کی مخلوق تو تعریف کرے، اور وہ قادر و مقتدر، رحمان و رحیم ہو کر بھی اس کی گرفت کرے؟۔ نتیجہ میں پروانہ بخشش عطا ہونے کی امیدیں بڑھ جایا کرتی ہیں۔

باجی جان ہم سات بھائی بہنوں میں سب سے بڑی تھیں، اس لئے انہیں اپنے والدین ہی نہیں، اپنی پھوپھیوں پھوپھاؤں، داداؤں دادیوں، اور رشتہ ناطہ کے تمام بھائی بہنوں کا بھرپور پیار ملا۔ اور کم از کم آٹھ سال بعد میری پیدائش تک تو وہ ہی سب کی آنکھوں کا تارابی رہیں۔ بعد میں پہلی اولاد زینہ ہونے کے ناطہ میری بھی اس میں شرکت ہو گئی تھی۔ یوں تو آج سے ساٹھ پینسٹھ برس قبل عام طور پر لڑکوں لڑکیوں کی شادیاں کم عمری ہی میں ہو جایا کرتی تھیں،

اور اگر اتفاق سے کسی لڑکی کی بیس برس کی عمر ہو جانے پر بھی شادی نہیں ہوتی تھی تو والدین واعزہ کافی فکر مند ہو جایا کرتے تھے؟۔ مگر میری باجی جان کی شادی اس دور کے سن و سال کے لحاظ سے بھی بہت کم عمری میں جب کہ وہ صرف چودہ برس کی تھیں ۱۹۵۷ء میں ایک ایسے یتیم لڑکے سے کر دی گئی تھی جو خود بھی بہت کم عمر اور دسویں جماعت میں زیر تعلیم تھا۔ ”گڈے گڑیا کا یہ بیاہ“ غالباً ضرورت اور شرعی تقاضے کو پورا کرنے سے زیادہ جانین کی ماؤں اور مربیوں کے ارمانوں کی دین تھا؟۔

بہر حال وہ بہت کم سنی ہی میں ماں بھی بن گئیں، اور یکے بعد دیگر پہلے ان کے دو بیٹے عبدالمنان اور عبدالجنان دنیا میں آئے، اس کے بعد بیٹی۔ اللہ کی مرضی کہ باجی جان کو اپنے ان دونوں بیٹوں کے جنازے اپنی آنکھوں سے دیکھنا پڑے۔ پہلے دوسرے بیٹے عبدالجنان کی ۲۰۰۵ء میں جب کہ وہ جوان العمر اور شادی شدہ تھے وفات ہوئی جس نے انہیں غم کا پیکر بنا دیا۔ پھر ابھی اسی سال ۱۱ جنوری ۲۰۲۰ء کو ان کے عالم و حافظ قرآن سب سے بڑے بیٹے عبدالمنان کی کئی ماہ کی تکلیف رساں علالت کے بعد وفات نے انہیں اندر سے پوری طرح کھوکھلا کر دیا تھا۔ بڑے اور انتہائی فرماں بردار بیٹے کی وفات سے کم و بیش ڈیڑھ برس پہلے ہی وہ اپنے شوہر محمد عرفان عالم صاحب کی رفاقت سے محروم ہو کر بیوہ بھی ہو چکی تھیں۔ اور یہ بھی رحمان و رحیم رب ہی کا فیصلہ تھا کہ ان کے سامنے فوت ہونے والے ان کے یہ دونوں بیٹے اپنے پیچھے اپنی اولاد بھی چھوڑ کر نہیں گئے کہ میری باجی جان کے لئے اپنے عزیز بیٹوں کی جدائی کے بعد ان کی کسی نشانی (بیٹی/بیٹے) ہی سے دل بستگی کا سامان ہو سکتا۔

بڑے اور اولین بیٹے عبدالمنان کی جدائی نے تو انہیں تصویر غم بنا دیا تھا۔ یوں تو عبدالمنان کی وفات سے کنبہ کے تمام چھوٹے بڑے خصوصی طور پر اس لئے متاثر رہے کہ ان کے ذریعہ ہمارے والدین سے لے کر بھائی بہنوں

تک سب ہی کو ایک نیا رشتہ ملا تھا۔ پھر ان کی برسوں چلنے والی علالت کی وجہ سے قابل رحم حالت اور بالآخر زندگی پر موت کی فتح نے ان کی یادوں کو کنبہ کے تمام افراد کے لئے ناقابل فراموش بنا دیا ہے۔ لیکن پہلے سے قلبی عارضہ اور شوگر کے مرض میں مبتلا ان کی ماں کی تو یہ حالت ہو گئی تھی کہ ان کے آنسو تھمنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ ان کی بے قراری و بے چینی کا یہ عالم تھا کہ ماں بیٹے کی جدائی کے درمیان کی دس ماہ کی مدت میں مجھے اپنی باجی سے ہونے والی کوئی ایسی ملاقات یاد نہیں جس میں انہوں نے اپنے بیٹوں خصوصاً عبدالمنان کا ذکر آہوں، سسکیوں، اور آنسوؤں کے ساتھ نہ کیا ہو۔ اب جب کہ وہ ہماری اس فانی دنیا سے رخصت ہو کر اپنے بیٹوں کے پاس پہنچ چکی ہیں تو ان شاء اللہ اس دنیائے فانی کی ساری بے چینیوں، بے قراریوں، اور مصائب کا صلہ انہیں اپنے رحیم و کریم رب سے ضرور ملے گا۔

باجی جان کا ذکر صرف اس لئے نہیں کہ وہ میری بڑی بہن تھیں اور ان کی جدائی کا فطری طور پر اثر ہے۔ بلکہ ان کی کچھ ایسی خصوصیات تھیں جن کا احساس ان کی زندگی میں بھی ان کے متعلقین کو تھا، لیکن اس درجہ نہیں جتنا ان کی جدائی کے بعد ہو رہا ہے؟۔ باجی جان کے بارے میں یہ بات ہمارے گھروں میں مشہور تھی کہ ان سے جب بھی ملاقات ہو، خاندان یا خاندان کے متعلقین کے سلسلہ میں کوئی نہ کوئی نئی اطلاع ضرور ملتی تھی۔ میں اکثر ان سے کہتا کہ چلنے پھرنے سے تقریباً معذور ہونے کی وجہ سے اپنے گھر میں تخت کے ایک مخصوص گوشہ ہی میں ہمیشہ نظر آنے کے باوجود اطلاعات کا یہ خزانہ تمہارے پاس کہاں سے آ جاتا ہے؟۔ شادی بیاہ اور بچوں کی پیدائش سے لے کر بیماری دکھی اور موت تک کی اطلاعات ہم لوگوں سے پہلے باجی جان کو ہو جایا کرتی تھیں، اور اکثر یہ بھی ہوتا تھا کہ ملاقات پر یا پھر موبائل کے ذریعہ وہی ہمیں باخبر کرتی تھیں۔ کیوں کہ اپنے موبائل کے ذریعہ اعزہ و اقربا اور متعلقین سے وہ ہم سب

سے زیادہ رابطہ میں رہا کرتی تھیں۔ بہت بہت دیر تک بات کرنا اور گھر کے ایک ایک فرد کی خیر و عافیت دریافت کرنا ان کے معمولات میں شامل تھا۔ والدہ مرحومہ کی تقلید میں آنے والے غرباء و مساکین کی دل جوئی اور حسب حیثیت ان کی خفیہ مدد و امداد سے بھی ان کو خصوصی دلچسپی تھی۔ پوتی پوتے، نواسی نواسے، اور گھر گھر انہ کے ایسے خرد سال بچے جن سے عموماً ہم لوگ بس تھوڑی دیر ان کے مطلب کی گفتگو کر لیا کرتے ہیں، اور اپنے کھیل کود کو چھوڑ کر نہ ان کا ہمارے پاس دل لگتا ہے، نہ ہی ان سے دیر تک باتیں کرنے کے لئے ہمارے پاس کچھ ہوتا ہے۔ ایسے بچوں کا باجی جان کے پاس بہت جی لگتا تھا، اور بسا اوقات گھنٹوں وہ ان سے ان کے ذوق کے مطابق باتیں کیا کرتی تھیں۔ خود مجھے یاد نہیں کہ میں ان کے پاس سے کبھی اٹھا ہوں اور انہوں نے مزید بیٹھنے کے لئے نہ کہا ہو؟ حالاں کہ ان کی رعایت میں عموماً میں کافی وقت فارغ کر کے ہی ان کے پاس جاتا تھا، مگر دو دو گھنٹہ کی ملاقات کے بعد بھی میں اٹھتا تو وہ یہی کہتیں کہ تم جان بوجھ کر ذرا دیر کے لئے آتے ہو۔ یہ معاملہ میرے ہی ساتھ نہیں تھا، بلکہ میری بیٹیاں اور بہویں جاتیں تو ان سے بھی یہی شکوہ رہتا۔ لطف یہ کہ ان کی گفتگو اتنی رسیلی اور دلچسپ ہوتی کہ کوئی اکتا کر ان کے پاس سے نہیں ہٹتا تھا، بلکہ دیگر ضروریات کے حوالہ سے ہی اٹھنا ہوتا تھا۔ کبھی بھی ایسا نہیں ہوتا تھا کہ باجی جان اپنی بیماری یا کسی ضرورت کا حوالہ دے کر اپنی طرف سے ملاقات و گفتگو کو مختصر یا ختم کرنا چاہتی ہوں۔ اللہ جانے کہ ان کی شخصیت میں ایسی کیا کشش اور ان کی باتوں میں ایسی کیا حلاوت ہوتی کہ ہمارے کنبہ ہی نہیں، ہماری پھوپھیوں اور چچاؤں وغیرہ کے کنبہ کے افراد کا بھی سب سے زیادہ باجی جان ہی کے پاس دل لگتا، اور سب کا ان ہی سے سب سے زیادہ رابطہ رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہر ایک کی زبان پر بس یہی ایک بات ہے کہ اس مشینی اور مطلب پرستی و خود غرضی کے دور میں اب ایسا کون ہوگا جو ایک

ایک کی خیریت لینے اور رابطہ بنائے رکھنے کے لئے اس طرح فکر مند ہوگا۔ اور اب بس یہی کہنا پڑ رہا ہے کہ۔

ایک ہنگامہ محفل ہو تو اس کو رولوں
سیکڑوں باتوں کا رہ رہ کے خیال آتا ہے

سچی بات یہ ہے کہ اس معاملہ میں باجی جان کو بھی اپنی امتیازی حیثیت کا احساس تھا، اور وہ میرے اس طرح ایک ایک گھر اور ایک ایک فرد کی خبر گیری پر روکنے ٹوکنے اور کبھی کبھار جھنجھلاہٹ کا شکار ہونے پر جو کچھ کہتی تھیں اس کا خلاصہ یہی ہوتا کہ۔

”اکیلی“ ہوں مگر آباد ”کر لیتی“ ہوں ویرانہ
بہت روئے گی میرے بعد میری شام تنہائی

یہ دنیا حسرتوں، تمناؤں، اور نہ ختم ہونے والی خواہشوں و چاہتوں کی آماجگاہ ہے ہی، اور باوجود اس ناقابل انکار حقیقت کا اقرار و اعتراف ہونے کے کہ یہ عالم فانی ہے اور یہاں جو بھی آتا ہے واپس جانے کے لئے ہی آتا ہے، جب بھی کوئی اپنا اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو اس کا ذکر کچھ اس طرح ہوتا ہے جیسے کوئی ان ہونی اور غیر متوقع بات ہوگئی؟ حالانکہ انسان اور انسانیت کے سب سے بڑے خیر خواہ اور منجر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کو باکار و بامراد بنانے کا نسخہ بتاتے ہوئے تاکید کے ساتھ یہ فرمایا ہے کہ اس دنیا کی زندگی کی لذتوں کا خاتمہ کر دینے والی چیز موت کو زیادہ سے زیادہ یاد رکھو گے تو بھگنے بھگنے، اور خالق و مخلوق دونوں کے حقوق کو تلف کرنے سے بھی محفوظ رہو گے اور عالم فانی سے عالم باقی تک ہر جگہ معزز و مکرم بن کر ہی رہو گے۔ میں اس بات کی شہادت دے سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے میری باجی جان اپنی موت کا ذکر کرتے ہوئے قبر کی ہولناکی اور عذاب قبر سے حفاظت کی دعا بڑی بے قراری کے ساتھ برابر کیا کرتی تھیں۔ خصوصاً اپنی موت سے

چند دنوں پہلے سے تو جیسے وہ موت کا کچھ اس طرح کثرت کے ساتھ ذکر کر رہی تھیں جیسے وہ اس کا استقبال کرنے کی منتظر ہوں۔ اور بہ قول فانی بدایونی موت کے انتظار میں متعدد بار خود کلامی کے انداز میں انہوں نے یوں بھی کہا کہ۔

تو کہاں ہے اے اجل اے نامرادوں کی مراد
مرنے والے راہ تیری عمر بھر دیکھا کئے

حق تعالیٰ ان کے ساتھ اپنی خصوصی رحمت کا معاملہ فرما کر ان کو اعلیٰ علیین میں مقام مرحمت فرمائے۔ (آمین)۔

برتر از اندیشہ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

***** ❁ *****

”گل بانگ ازل“ پر ایک نظر

سب سے پہلے تو میں شکر یہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں اپنے پچاسی سالہ مخلص و محترم بزرگ الحاج محمد احمد ادیب صاحب کا کہ جن کی خصوصی توجہ و کرم فرمائی سے یہ کتاب میرے ہاتھوں تک آئی۔

ہمارے ادیب صاحب لکھنوی سچ دھج کے ایک ٹٹماتے چراغ کی صورت ہمارے درمیان بہ فضل خدا اس صورت میں کہ جن کی خوش اخلاقی، خوش گفتاری، اور خرداں نوازی جیسی متعدد خوبیاں لائق ذکر ہیں۔ لیکن ان کی اپنی مادری اور شیریں زبان اردو کے لئے بیش بہا قربانیاں، اور وضعداری، دوا لیبی اہم خوبیاں ہیں جنہیں تہذیبوں کے زوال، اور قدروں کے پائمالی کے اس دور میں ادیب صاحب کی شناخت قرار دیا جاسکتا ہے۔

برسوں پہلے انہیں ”مجاہد اردو“ کا خطاب تو اس وقت ملا تھا جب یادش بخیر ”اردو محافظ دستہ“ کے بینر تلے انہوں نے اپنے چند مخلص ساتھیوں کے ساتھ سر سے کفن باندھ کر، اور حکومت وقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ”اردو یا موت“ کے نعرہ یا ”لوگو“ کے ساتھ ایک تاریخ ساز تحریک چھیڑ کر نہ صرف ہر قسم کے ظلم و تشدد اور قید و بند کی صعوبتیں جھیلی تھیں، بلکہ اپنی پر زور و پر شور آوازوں سے ایوان اقتدار میں زلزلہ ڈال کر حکومت و اقتدار کے نشہ میں مست لوگوں کو بیدار ہونے اور جھکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ ادیب صاحب کی بھری جوانی اور

میرے بچپن کا زمانہ تھا، اس لئے میں اس کی تفصیلات تو نہ بیان کر سکوں گا کہ اس تحریک کے نتیجہ میں اردو کو اس کے جائز و آئینی حقوق میں سے کچھ مل بھی سکے تھے یا صاحبان اقتدار نے اپنی پرفریب چالوں سے کام لے کر صرف اشک شوقی اور طغی تسلیوں ہی سے کام چلا لیا تھا؟۔ اب جب کہ ادیب صاحب کے وہ تمام سرفروش و کفن بردوش ساتھی ایک ایک کر کے اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں تو ادیب صاحب تقریباً تنہا ہی اردو زبان اور اردو تہذیب کو اپنے ناتواں کاندھوں پر اس طرح ڈھوئے ہوئے ہیں کہ ان کے کاندھے، ان کی کمر، اور ان کے گھٹنے بھی ان کا ساتھ دینے سے گریزاں ہیں۔ مگر وہ اپنے بزرگ و مرحوم بھائی اور مربی عبدالرشید خاں قمر لکھنوی کے شعر۔

مشکلیں ہی مشکلیں ہیں کارواں کے سامنے

ہیچ ہیں لیکن مرے عزم جواں کے سامنے

کو اپنا شعار بنا کر پوری وضعداری کے ساتھ اس طرح سرگرم رہنا چاہتے تھے ہیں جیسے وہ ۸۵ سالہ بزرگ نہیں، ۲۵ سالہ جواں ہوں، اور ضعف و امراض کے تمام عوارض کو شکست دینے کا فیصلہ کر چکے ہوں؟۔

اللہ اسی طرح حوصلوں کی توانائی کے ساتھ ان کی عمر دراز کرے۔ آمین کتاب اور صاحب کتاب کے ذکر سے پہلے ادیب صاحب کا بے ساختہ قدرے طویل ذکر اس لئے ہو گیا کہ ”لاک ڈاؤن“ اور ”ان لاک ڈاؤن“ کے اس پرتیج اور حوصلہ شکن دور میں ادیب صاحب ”اپنی شان امتیازی“ کے ساتھ رات کو ساڑھے دس بجے تنہا میرے مکان آئے۔ اور اپنی دیرینہ وضعداری کو نباتے ہوئے ”گل بانگ ازل“ نامی اس کتاب کا تحفہ کسی دوسرے کے ہاتھوں نہ بھیجا کر خود اپنے ہاتھوں مجھے عطا کیا، اور اس کا ثبوت دیا کہ ع

ابھی شہر میں کچھ لوگ باقی ہیں

”گل بانگ ازل“ علامہ رشید قمر لکھنوی کی نعتوں و منقبتوں کا ایک منتخب مجموعہ ہے۔ اس لئے کچھ گفتگو کا آغاز قمر صاحب مرحوم کے اس قطعہ سے ہی کرنا مناسب ہے کہ۔

شعر اور شاعری کی بات کریں
فکر اور آگہی کی بات کریں
اور بھی تو ہیں شاعران کرام
کیا قمر لکھنوی کی بات کریں

قمر صاحب اور ان کے کلام سے مناسبت و دلچسپی کا میرا رشتہ انتاقدیم اور اتنا نشاط افزا ہے کہ اس کا مختصر سے مختصر بیان بھی بہت سے قارئین کو غیر ضروری اور ”طول ممل“ نظر آئے گا۔ اس لئے قمر صاحب سے اپنے تعارف اور پھر ان کی شفقتوں و عنایتوں سے سرشار ہوتے رہنے کی پہل کو بیان کرنے ہی پر اکتفا کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میرے عم بزرگوار مولانا عبدالمومن فاروقی مرحوم کے شہرہ آفاق ہفت روزہ اخبار ”حرم“ کا دفتر ان کے رہائشی مکان کے باہری کمرہ میں تھا۔ اور یہ کمرہ یا دفتر صبح سے لے کر شام تک مقامی و بیرونی علماء، شعراء و ادباء سے بھرا رہتا تھا، اور چچا صاحب مرحوم کی ممتاز و خوش ذائقہ ”پودینہ کی کالی چائے“ کے جام پر جام چلا کرتے تھے۔ میں اس وقت ایک کم سن بچہ تھا جو چچا صاحب کی خصوصی شفقتوں کی وجہ سے ان سے بہت مانوس تھا، اور اپنی پڑھائی کے بعد فارغ وقت کا کافی حصہ چچا صاحب کے گھر اور دفتر میں بڑی دلچسپی کے ساتھ گزارا کرتا تھا۔ اور اسے میری خوش بختی کہنے کہ چچا صاحب اور ان کے یہاں آنے والے احباب کی اکثر باتیں اپنی حد پرواز سے بلند ہونے کی بنا پر نہ سمجھنے کے باوجود بھی شریک مجلس ہو کر ان کی باتیں سننے میں ایک انجانا سا لطف و مزہ آیا کرتا تھا۔

چچا صاحب کے اسی ”دفتر حرم“ میں رشید قمر لکھنوی صاحب سے بھی پہلی ملاقات ہوئی جو قریب قریب روز کے آنے والوں میں تھے۔ اور قمر صاحب اپنی شاعری، اور چچا صاحب اپنے خصوصی مضامین ایک دوسرے کو سنا کر کافی کافی دیر تک تبادلہ خیال کیا کرتے تھے، میں نے دیکھا اور پایا کہ قمر صاحب کو نہ صرف چچا صاحب بلکہ میرے اس وقت کے خاندان کے تمام چھوٹے بڑے افراد، خصوصاً جد امجد امام اہل سنت حضرت مولانا محمد عبدالشکور صاحب سے والہانہ و عقیدت مندانہ تعلق تھا۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب قمر صاحب ”شاہ صاحب“ نہ ہو کر قمر لکھنوی کی حیثیت سے صرف ایک شاعر تھے۔ اور شاعر بھی شاعر مداح رسول و مداح صحابہ!

پھر مجھے نہیں معلوم کہ ایسا کیا ہوا کہ قمر صاحب نے لکھنؤ چھوڑ کر کانپور کو اپنا وطن بنا لیا۔ کانپور کے اپنے جن قدردانوں اور ان سے عشق کی حد تک محبت کرنے والوں کا ذکر خود قمر صاحب کی زبان سے بھی اور ان کے برادر خرد الحاج محمد احمد خاں صاحب ادیب کی زبان سے بھی متعدد بار سنا وہ دونمائیاں نام اکمل ادیب اور ماجد جاسسی مجھے یاد رہ گئے۔ اگرچہ میری ان دونوں حضرات میں سے کسی سے ملاقات نہیں ہوئی، لیکن قمر صاحب سے مشترکہ رشتہ محبت کی وجہ سے یہ دونوں نام خصوصاً اول الذکر اکمل ادیب صاحب اور ان کی ”پونم کلچرل سوسائٹی“ کے نام میرے لئے مانوس ہیں۔

یاد آتا ہے کہ اسی ”پونم کلچرل سوسائٹی“ کے زیر اہتمام کافی عرصہ پہلے قمر صاحب کا منتخب کلام پاکٹ سائز کی ایک کتاب میں شائع ہوا تھا، اور وہ کتاب قمر صاحب مرحوم نے مجھے اپنے ہاتھوں سے دی تھی؟۔ چوں کہ اب وہ کتاب میرے پاس موجود نہیں ہے اس لئے اس کا ذکر اپنی یادداشت سے کیا ہے۔ امید ہے کہ اس سلسلہ میں میری یادداشت نے غلطی نہ کی ہوگی۔ اور اب اسی سوسائٹی کے زیر اہتمام اور اکمل ادیب صاحب کی قمر صاحب مرحوم سے

محبت و عقیدت کا مظہر یہ زیر نظر مجموعہ کلام قمر بہ عنوان ”گل بانگ ازل“ پوری آب و تاب کے ساتھ شائع ہو کر میرے ہاتھوں تک پہنچا ہے جو قمر صاحب کے منتخب نعتیہ و منقبتی کلام پر مشتمل ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ یہ مختصر مجموعہ کلام بہ قامت کہتر و بہ قیمت بہتر ہونے کے باوجود قمر صاحب کے چاہنے والوں کے لئے نہایت ہی ارزاں ہے۔ کیوں کہ ان کے چہیتے شاگرد و عقیدت مند جناب اکمل ادیب صاحب نے اس کا ہدیہ..... فی سبیل اللہ رکھ کر قمر صاحب اور ان کے کلام تک رسائی کو آسان بنا دیا ہے۔

میں قمر صاحب کے کلام پر کوئی تبصرہ کیا کروں میں تو بچپن ہی سے اس کا ایسا دلدادہ رہا ہوں کہ خود صاحب کلام کی زبان سے سن سن کر اور اخبار ”حرم“ میں پڑھ پڑھ کر ان کے اشعار یاد کر لیا کرتا تھا۔ اور کبھی موقع ملنے پر جب ان کے اشعار ان کو سناتا تو وہ میرے حافظہ کی تعریف کرتے ہوئے دعاؤں سے نوازتے تھے۔ انہوں نے میرے لئے ”فرمانشی نظمیں“ بھی کہیں اور ”منظوم فرمانشی نظامت“ بھی کی۔ اور جب طبیعت جوش میں آئی تو مجھ سے ناصحانہ انداز میں والد ماجد مرحوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ ۔

شعور و فکر حلیم آج کی ضرورت ہے
شعرا ضرب کلیم آج کی ضرورت ہے

البتہ زیر نظر کتاب کے صفحہ ۶ کی تحریر نے مجھے ضرور چونکا پایا، جس میں قمر صاحب کے استاذ علامہ انور صابری نے قمر صاحب کو اپنی روحانی خلافت عطا کرتے ہوئے انہیں حکم دیا ہے کہ

”وہ اللہ کے بندوں کو راہ راست دکھا کر، بواسطہ اکابر داخل

سلاسل متبرکہ مذکورہ کریں“

میں نے قمر صاحب کو درویشانہ لباس اور کامل دراز کے ساتھ بار بار دیکھنے کے باوجود یہ نہیں جانا تھا کہ وہ تصوف و روحانیت کے اس اعلیٰ مقام پر

فائز ہیں کہ ”پیر و مرشد“ بن کر اللہ کے بندوں کو راہ راست دکھانے کا ذریعہ بن سکیں؟

اسی طرح ان کے استاذ محترم علامہ انور صابری کا نام تو ”تحریک مدح صحابہ“ کے حوالہ سے بچپن ہی سے کانوں میں پڑ چکا تھا، اور ان کی پہلی زیارت بھی دفتر ”حرم“ میں ہو چکی تھی۔ پھر دارالعلوم دیوبند کی طالب علمی کے دوران متعدد مرتبہ ان کی قیام گاہ پر حاضری دینے، اور مشاعرہ کے اندران کی پاٹ دار آواز میں کلام شاعر بہ زبان شاعر سننے کا موقع بھی میسر آچکا تھا۔ اسی کے ساتھ ان کی صابری سلسلہ سے وابستگی کا بھی اجمالی طور پر علم تھا۔ یہ بھی علم تھا کہ وہ قمر صاحب کے ایسے استاذ ہیں جن سے قمر صاحب واقعی بہت ڈرتے تھے۔ پھر علامہ انور صابری کی اپنے اکابر خصوصاً شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور امام اہل سنت حضرت مولانا محمد عبدالشکور صاحب سے عقیدت مندانہ رشتوں کی بھی جان کاری تھی۔ ان سب کے باوجود یہ علم نہ تھا کہ صابری صاحب باقاعدہ بزرگوں سے مجاز ہو کر ایک ایسے مرشد بھی ہیں جو بیعت لے کر دوسروں کو داخل سلسلہ کرتے ہیں؟۔

زیر نظر کتاب ”گل بانگ ازل“ کے ذریعہ ہونے والے یہ دونوں انکشاف میرے لئے چشم کشا بھی ہوئے اور فرحت افزا بھی۔ کیوں کہ ان دونوں باکمالوں سے میرا بھی کسی نہ کسی درجہ کا رشتہ رہا ہے۔

آخر میں جناب اکمل ادیب صاحب کو اس خوبصورت و پر مغز کتاب کے اشاعت پر مبارک باد دیتے ہوئے دعا گو ہوں کہ حق تعالیٰ ان کی اس فیض رسانی کا سلسلہ تادیر قائم رکھے۔ (آمین)